

Women Writers  
Classics

عصمت چغتائی  
(۸)



افسانے

بدن کی خوشبو  
عصمت چغتائی

RHOTAS

L P S

Low Priced Series

# بدن کی خوشبو

افسانے

عصمت چغتائی

روہتاس بکس



پیشکش کی کتاب  
جلد ۱

جملہ حقوق محفوظ

۱۹۹۲ء

اشاعت اول

نفس پر نثرز چنیا لہ گراؤنڈ لاہور

پر نثرز

روہتاس بکس احمد چیمبر ۵ - ٹیمپل روڈ لاہور

پبلشرز

## بدن کی خوشبو

### ترتیب

☆ ۵ مٹی چھوٹی

☆ ۱۲ گھونگھٹ

☆ ۱۷ ہندوستان چھوڑ دو

☆ ۳۵ روشن

☆ ۵۱ کارساز

☆ ۶۴ بدن کی خوشبو



## چھوٹی موٹی

آرام کرسی ریل کے ڈبے سے لگا دی گئی اور بھائی جان نے قدم اٹھایا ”الہی خیر!..... یا غلام دے گئے..... بارہ اماموں کا صدقہ۔ بسم اللہ بسم اللہ..... بیٹی جان سنبھل کے..... قدم تھام کے..... پانچہ اٹھا کے..... سچ سچ بی مغلانی نقیب کی طرح للکاریں۔ کچھ میں نے گھسینا کچھ بھائی صاحب نے ٹھیلنا۔ تعویذوں اور امام ضامنوں کا اشتہار بنی بھائی جان تنے ہوئے غبارے کی طرح ہانپتی سیٹ پر لڑھک بیٹھیں۔

”پاک پروردگار تیرا شکر“ بی مغلانی کے منہ سے اور ہمارے دلوں سے نکلا بغیر ہاتھ پھیر ہلائے ہانپ جانے کی عادت شاید وہ ساتھ لے کر تو پیدا نہ ہوئی ہوں گی اور نہ اناؤں دایاؤں کی لاڈ بھری گودوں میں ان کا اچار پڑا۔ پھر بھی اوسط درجے کی خوبصورت دہلی پتلی لڑکی چند ہی سال میں پھپھو لے کی طرح نازک بن گئی۔ بات یہ ہوئی کہ سیدھی ماں کے کولہے سے توڑ بھائی جان کے پلنگ کی زینت بنا دی گئیں اور وہاں ایک شگفتہ پھول کی طرح پڑے مہکنے کے سوا ان پر زندگی کا اور کوئی بار نہ پڑا۔ بی مغلانی شادی کے دن سے انہیں پالنے پوسنے پر مقرر کر دی گئیں۔ صبح سویرے یعنی جب بڑے لوگوں کی صبح ہوتی ہے۔ سلیبی میں منہ دھلا کر وہیں مسہری پر جوڑا بدل کر چوٹی کنگھی سولہ سنگار کر کے بھرپور دلی کے ناشتے کا خوان سامنے چن لیا جاتا



جیسے صاف کر کے میری پھولے پھولے کلوں والی بھابی ہتھیلی پر ٹھڈی رکھے بیٹھی مسکرایا کرتیں۔

لیکن یہ مسکراہٹیں شادی کے دوسرے ہی سال پھکی پڑ گئیں اور ان کا سلسلہ ہر وقت تھوکنے اور قے کرنے میں گزرنے لگا۔ ممکنہ ہوئے پھولوں میں لدی مہ پارہ کے بجائے اس روگ میں متبادل بیوی کو پا کر بھائی جان بھی بدکنے لگے۔ مگر اماں بیگم اور بی مغلانی کے یہاں تو جانو بہار آگئی۔ پہلے ہی مہینے سے گدیلمے پوتڑے اس زور و شور سے سنے لگے جانو کل ہی پرسوں میں زچگی ہونے والی ہے۔ مارے تعویذوں کے جسم پر تل دھرنے کی جگہ نہ رہی، آئے دن کے ٹونے ٹونے دم بولانے لگے۔ ویسے ہی بھابی جان کے دشمن کا ہے کو چلنے پھرنے کے شوقین تھے۔ اب تو بس کروٹ بھی لیں تو مغلانی بی اللہ بسم اللہ کے جی جی کاروں سے گھر سر پر اٹھا لیتیں اور بس دن بھر وہ کچے گھرے کی طرح سینٹ کر رکھی جاتیں۔ صبح شام پیر فقیر دم درود کرنے اور پھونکیں مارنے آتے۔

لیکن باوجود کہ مغلانی کا پرہ سخت تھا، کچا گھڑا وقت سے پہلے ہی کھل گیا اور ارمانوں پر پانی پھر گیا۔ ڈال پھر خالی رہ گئی۔ بور جھڑ گیا۔ پر جان بچی لاکھوں پائے اللہ اور دے گا۔ گھر کی دولت ہے۔ اللہ نے اور دیا۔ پرہ پہلے سے چوگنا ہو گا۔ مگر پھر ہاتھ خالی۔ تیسری دفعہ تو معاملہ پہلے سے چوگنا ہو گیا۔ مگر پھر ہاتھ خالی۔ تیسری دفعہ تو معاملہ ذرا قابل غور بن گیا۔ مارے دواؤں کے بھابی جان کا ہلیتھن نکل گیا۔ رنگ ایک سرے سے غائب۔ صرف پھولی پھولی اہلی ہوئی شکر قند جیسی رہ گئیں۔ بھابی جان کی شام رات کے بارہ بجے ہونے لگی۔ بی مغلانی اور اماں بیگم کے تپور بھی ذرا چڑھنے اترنے لگے اور بھابی جان کو مسسری پر پڑے پڑے بھائی جان کی دوسری شادی کے شادیانے سنائی دینے لگے۔

اور جب اللہ اللہ کر کے پھر وہ دن آیا تو پیروں مریدوں کے علاوہ دہلی کے ڈاکٹر بھی اپنے سارے تیر تفنگ لے کر تعینات ہو گئے۔ خدا کے کرم سے انگنا مہینہ لگا اور بھابی جان صابن کے بلبلے کی طرح روئی کے پھولوں پر رکھی جانے لگیں۔ کسی



کو قریب کھڑے ہو کر چھینکنے یا ناک شکنے کی بھی اجازت نہ تھی مبادا رد عمل سے بلبلہ شق نہ ہو جائے۔

اب ڈاکٹروں نے کہا خطرہ نکل گیا تو اماں بیگم نے بھی سوچا کہ زچگی علی گڑھ ہی میں ہو۔ ذرا سا تو سفر ہے گو بھابی جان دلی دلی چھوڑتے لرزتی تھیں۔ جہاں کے ڈاکٹروں نے ان کا اتنا سفر صحیح و سالم کنوا دیا تھا۔ اب آنکھوں کی سوئیاں ہی تو رہ گئی تھیں۔ دوسرے وہ زمانے کے تپور دیکھ رہی تھیں، اگر اب کے وار خالی گیا تو بھابی جان کو ان کے سینے پر سوت لانے میں کوئی بہانہ بھی آڑے نہ رہے گا اب تو وہ نام چلائے والے کی آڑ لے کر سب کچھ کر سکتے تھے۔ خبر نہیں بیچارے کو اتنا اپنا نام زندہ رکھنے اور اسے چلانے کی کیوں فکر پڑی تھی حالانکہ خود ان کا کوئی اونچا نام تھا ہی نہیں۔ دنیا میں۔ مسہری کی زینت کا جو ایک اہم فرض ہے، اگر وہ بھی نہ پورا کر سکیں تو یقیناً انہیں سکھ کی بیج چھوڑنا پڑے گی۔ یہ چند سال نوجوانی اور حسن کے بل بوتے پر وہ ڈٹی رہیں، پر اب تو ذرا تخت کے پائے ڈگمگاتے جا رہے تھے اور وہ انہیں الٹ دینے کو تیار تھا اور پھر اس تخت سے اتر کر بے چاری کے پاس دوسری جگہ کہاں تھی۔ سینا پرونا تو انہوں سے سیکھا اور نہ اس میں جی لگ دو بول پڑھے تھے، سو وہ بھی بھول بھال گئی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا میں اگر ان کا کوئی کھلانے پلانے والا نہ رہے تو وہ صرف ایک کام اختیار کر سکتی ہیں۔ یعنی وہی خدمت جو وہ بھابی جان کی کرتی تھیں خلق خدا کی کریں۔

لہذا وہ جی جان سے اس بار ایک ایسا ہتھیار مہیا کرنے پر تلی ہوئی تھیں جس کے سہارے ان کے کھانے پینے کا انتظام تو ہو جاتا۔ باپ نہ ہی دادا دادی نوپالیر گئے ہی۔

زہر دست کا ٹھینکا سر پر۔ اماں بیگم کا نادر شاہی حکم آیا اور ہم لوگ یوں لدے پھندے علی گڑھ چل پڑے۔ نئے تعویذوں اور ٹونکوں سے لیس ہو کر بھابی جان میں بھی اتنی ہمت ہو گئی۔

”الہی خیر“ بی مغلانی انجن کی ٹکر سے بے خبری میں دھڑام سے گریں اور



بھابی جان نے لیٹے لیٹے دونوں ہاتھوں سے گھڑا دیوچ لیا۔

”ہے ہے یہ گاڑی ہے کہ بلا چلا الٹی پیروں کا صدقہ..... اے مشکل کشا، بی مغلانی بھابی جان کا پیٹ تھام کر بد کر کے درود اور کلام پاک کی آیتیں پڑھنے لگیں۔ خدا خدا کر کے غازی آباد آگیا۔

طوفان میل کا نام بھی خوب ہے۔ دندنا تی چلی جاتی ہے۔ رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ڈبہ پورا اپنے لئے ریزرو تھا۔ بھیڑ بھاڑ کا خدشہ ہی نہ تھا۔ میں کھڑکی کے سامنے والی گاڑی میں بھری ہوئی مخلوق سے مطالعے میں محو اور بی مغلانی انجن کی سیٹی کے خوف سے کان بند کئے بیٹھی تھیں۔ بھابی جان کو تو دور ہی سے بھیڑ کو دیکھ کر چکر آگیا اور وہ وہیں پڑی پر سر گئیں۔ جوں ہی ریل رستنگی، ڈبہ کا دروازہ کھلا اور ایک کنواری گھنے لگی۔ قلی نے بہتیرا گھسینا، مگر وہ چلتی ریل کے پائیدان پر ڈھیٹ چھپکلی کی طرح لٹک گئی اور بی مغلانی کی ”ہیں ہیں“ کی پرواہ نہ کر کے اندر رینگ آئی اور غسل خانے کے دروازے سے پیٹھ لگا کر ہانپنے لگی۔

”اے ہے مولیٰ توبہ ہے“ بی مغلانی منمنائیں۔ ”اے نگوڑی کیا پورے دن سے ہے۔“

”ہانپتی ہوئی بیدم عورت نے اپنے پیڑیاں جمے ہونٹوں کو بمشکل مسکراہٹ میں پھیلایا اور اثبات میں سر ہلایا۔

”اے خدا کی سنوار دیدہ تو دیکھو سردار کا..... توبہ ہے اللہ توبہ“ اور وہ باری باری اپنے گالوں پر تھپڑ مارنے لگیں۔

عورت نے کچھ جواب نہ دیا صرف درد کی شدت سے تڑپ کر غسل خانے کا دروازہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ سانس اور بے ترتیب ہو گیا اور پیشانی پر پسینے کے قطرے ٹھنڈی مٹی پر اوس کی بوندوں کی طرح پھوٹ آئے۔

”اری کیا پلوٹھی کا ہے؟“ بی مغلانی نے اس کے الھڑپن سے خوفزدہ ہو کر کہا اور اس بار کرب کا ایسا حملہ پڑا کہ وہ جواب ہی نہ دے سکی۔ اس کے چہرے کی ساری رگیں کھینچنے لگیں، لمبے لمبے آنسو اس کی ابلی ہوئی آنکھوں سے پھوٹ نکلے۔



بی مغلانی ہے ہے 'اوی' ہائے' کرتی رہیں اور وہ درد کی لہر کو گھونٹتی رہی۔ میں بسور رہی تھی اور بھابی جان سسکیاں لے رہی تھیں۔

"اے ہے بی گنوا ری کیا مزے سے بیٹھی دیکھ رہی ہو۔ اے بیٹی ادھر منہ کر کے بیٹھو" اور گنوا ری نے جلدی سے منہ ادھر کر لیا۔ پھر جوں ہی درد کی لہر سے تڑپ کر اس نے آواز نکالی، گردن قابو میں نہ رہ سکی، اور بی مغلانی نے صلواتیں سنائی شروع کیں۔ "اونہ توبہ جیسے ایک بچے کو دنیا میں داخل ہوتے دیکھ کر میرا کنوار پن کٹ ہی تو جائے گا۔" بھابی جان دوپٹہ منہ پر لپیٹے بسور رہی تھیں۔ بی مغلانی ناک پر برقعہ رکھے خی خی تھوک رہی تھیں اور ریل کے فرش کی جان کو رو رہی تھی۔

ایک دم ایسا معلوم ہوا ساری دنیا سکر کر کھڑی ہو گئی۔ فضا گھٹ کر میڑھی میڑھی ہو گئی۔ شدت احساس سے میری کنپٹیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح اکڑ گئیں اور بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ میں نے سوچا عورت اب مری اور اب مری کہ ایک دم سے فضا کا تشنج رک گیا۔ بی مغلانی کی ناک کا برقعہ پھسل پڑا اور بالکل بھابی جان کی سلیم شاہی جوتیوں کے پاس لال لال گوشت کی بوٹی آن پڑی۔ حیرت اور مسرت کی ملی جلی چیخ میرے منہ سے نکلی اور جھک کر اس ننھی سی کائنات کو دیکھنے لگی جس نے اپنا لہبا چوڑا دہانہ کھول کر ہائے توبہ ڈال دی۔

بی مغلانی نے میری چوٹی پکڑ کر مجھے کونے میں ٹھونس دیا اور اس عورت پر گالیوں اور ملامتوں کا طومار لے کر ٹوٹ پڑیں۔ میں نے سیٹ کے کونے سے آنسوؤں کی چلمن سے جھانک کر دیکھا تو وہ عورت مری نہ تھی۔ بلکہ اس کے سوکھے ہوئے ہونٹ جنہیں اس نے چبا ڈالا تھا۔ آہستہ آہستہ مسکراہٹ میں پھیل رہے تھے۔ اس نے ننھے سے سائل کی داویلا سے بے چین ہو کر آنکھیں کھول دیں۔ آڑی ہو کر اس نے اسے اٹھالیا۔ کچھ دیر وہ اپنے نا تجربہ کار ہاتھوں سے اسے صاف کرتی رہی۔ پھر اس نے اوڑھنی سے دھجی پھاڑ کر ٹال کو کس کر باندھ دیا۔ اس کے بعد وہ بے کسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ مجھے اپنی طرف مخاطب دیکھ کر وہ ایک دم



کھل کھلا کر ہنس پڑی ”کوئی چھری چکو ہے بی بی جی؟“

بی مغلانی گالیاں دیتی رہ گئیں۔ بھابی جان نے بسور کر میرا آنچل کھینچا پر میں نے ناخون کاٹنے کی قینچی اسے پکڑا دی۔

اس کا سن میرے ہی اتنا ہو گیا شاید سال چھ مہینے بڑی ہو۔ وہ اپنے الھڑ، نا تجربہ کار ہاتھوں سے ایک بچہ کا نال کاٹ رہی تھی جو اس نے چند منٹ پہلے شتر جیتا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے وہ بھیڑ بکریاں یاد آنے لگیں جو بغیر دائی اور لیڈی ڈاکٹر کی مدد کے گھاس چرتے چرتے پیڑ تلے زچہ خانہ رہا لیتی ہیں اور نوزائیدہ کو چاٹ چاٹ کر قصہ ختم کرتی ہیں۔

بزرگ لوگ کنواری لڑکیوں کو بچہ کی پیدائش دیکھنے سے منع کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ زیب النساء نے اپنی بہن کے ہاں بچہ پیدا ہوتے دیکھ لیا تھا تو وہ ایسی ہیبت زدہ ہوئی کہ ساری عمر شادی ہی نہ کی۔ شاید زیب النساء کی بہن میری بھابی جان جیسی ہو گی، ورنہ اگر وہ اس فقیرنی کے بچہ پیدا ہوتے دیکھ لیتی تو میری ہی ہم خیال ہو جاتی کہ سب ڈھونگ رہا کرتے ہیں۔ بچہ پیدا کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا بھابی جان کے لئے ریل پر سوار ہونا یا اترنا۔

اور مجھے تو ایسی بھیانک قسم کی شرم کی بات بھی نہ معلوم ہوئی۔ اس سے کہیں زیادہ بے ہودہ باتیں بی مغلانی اور اماں ہر وقت مختلف عورتوں کے بارے میں کیا کرتی تھیں جو میرے کچے کانوں میں جا کر بھنے چنوں کی طرح پھوٹا کرتی تھیں۔ تھوڑی دیر تو وہ پھوہڑپن سے بچے کو دودھ پلانے کی کوشش کرتی رہی۔ آنسو خشک ہو چکے تھے اور وہ کبھی کبھی ہنس رہی تھی جیسے اسے کوئی گدگدا رہا ہو۔ پھر بی مغلانی کے ڈانٹنے پر وہ سسم گئی اور بچے کو چیتھڑوں میں لپیٹ کر الگ سیٹ کے نیچے رکھ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ بھابی جان کی چیخ نکل گئی۔

اتنے میں بی مغلانی بھابی جان کو ٹٹولتی سہلاتی رہیں۔ اس نے ہاتھ روم سے پانی لا کر ڈبہ کو صاف کرنا شروع کیا۔ بھابی جان کی زرکار سلیم شاہی دھوپو نچھ کر کونے سے لگا کر کھڑی کر دی۔ پھر اس نے پانی اور پھیتھڑوں کی مدد سے ڈبہ سے



جملہ زچگی کے نشانات دور کر ڈالے۔ اتنے میں ہم تینوں مقدس بی بیوں پر لدی احمقوں کی طرح اسے دیکھتی رہیں۔ اس کے بعد وہ بچہ کو چھائی سے لگا کر ہاتھ روم کے دروازے کے سارے ہو بیٹھی جیسے کوئی گھر کا معمولی کام کاج کر کے جی بھلانے فرصت سے بیٹھ جائے اور پنے چباتے چباتے اونگھ گئی۔

پر گاڑی کے دھچکے سے وہ چونک پڑی۔ گاڑی رکتے رکتے اس نے ڈبے کا دروازہ کھولا اور پیر تولتی اتر گئی۔

ٹکٹ چیکر نے پوچھا ”کیوں ری ٹکٹ؟“ اور اس نے مسرت سے بے تاب ہو کر جھولی پھیلا دی جیسے وہ کہیں سے جھڑبیری کے پیر چرا کر لائی ہو۔ ٹکٹ چیکر منہ پھاڑے کھڑا رہ گیا۔ اور وہ ہنستی پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی بھینر میں گم ہو گئی۔

”خدا کی سنوار ان خانگیوں کی صورت پر۔ یہ حرامی حلالی جنتی پھرتی ہیں مولیٰ جادوگر نیاں“ بی مغلانی بڑبڑائیں۔ ریل نے ٹھوکر لی اور چل پڑی۔

بھابی جان کی سسکیاں ایک منظم چیخ میں ابھر آئیں ”ہے ہے مولا خیر ہے بیگم دلہن!“ بی مغلانی ان کا متغیر چہرہ دیکھ کر لرزیں۔ اور وہاں خیر غائب تھی!

اور بھابی جان کے ہونق چہرے پر بھائی جان کی دوسری شادی کے تاشے باجے خزاں برسانے لگے۔

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کند

دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

نئی روح دنیا میں قدم رکھتے جھجک گئی اور منہ بسور کر لوٹ گئی۔ میری پنج پھلا رانی نے جو طلسم ہوش ربا نسیم کی زچگی دیکھی تو مارے ہیبت کے حمل کر گیا۔





## گھونگھٹ

سفید چاندنی بچے تخت پر بگے کے پروں سے زیادہ سفید بالوں والی دادی بالکل سنگ مرمر کا بھدا سا ڈھیر معلوم ہوتی تھیں۔ جیسے ان کے جسم میں خون کی ایک بوند نہ ہو۔ ان کی ہلکی سرمئی آنکھوں کی پتلیوں تک پر سفیدی رینگ آئی تھی اور جب وہ اپنی بے نور آنکھیں کھولتیں تو ایسا معلوم ہوتا۔ سب روزن بند ہیں۔ کھڑکیاں دبیز پردوں کے پیچھے سہمی چھپی بیٹھی ہیں۔ انہیں دیکھ کر آنکھیں چونڈھیا نے لگتی تھیں جیسے ارد گرد پس ہوئی چاندی کا غبار معلق ہو۔ سفید چنگاریاں سی پھوٹ رہی ہوں۔ ان کے چہرے پر پاکیزگی اور دوشیزگی کا نور تھا۔ اسی برس کی اس کنواری کو کبھی کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

جب وہ تیرہ چودہ برس کی تھی تو بالکل پھولوں کا گچھا لگتی تھیں۔ کمر سے نیچے جھولتے ہوئے سنہری بال اور میدہ شہاب رنگت۔ شباب زمانہ کی گردش نے چوس لیا صرف میدہ رہ گیا ہے۔ ان کے حسن کا ایسا شہرہ تھا کہ اماں باوا کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ ڈرتے تھے کہیں انہیں جنات نہ اڑا کے لے جائیں کیونکہ وہ اس دھرتی کی مخلوق نہیں لگتی تھی۔

پھر ان کی منگنی ہماری اماں کے ماموں سے ہو گئی۔ جتنی دلہن گوری تھی اتنے ہی دولہا میاں سیاہ بھٹ تھے۔ رنگت کو چھوڑ کر حسن و مردانگی کا نمونہ تھے کیا ڈی ہوئی پھٹارا آنکھیں تلوار کی دھار جیسی کھڑی ناک اور موتیوں کو ماند کرنے والے دانت مگر اپنی رنگت کی سیاہی سے بے طرح جڑتے تھے۔

جب منگنی ہوئی تو سب نے خوب چھیڑا۔



”ہائے دولہا ہاتھ لگائے گا تو دلہن میلی ہو جائے گی۔“

”چاند کو جانو گرہن لگ جائے گا۔“

کالے میاں اس وقت سترہ برس کے خود سر بگڑے دل پھٹے تھے۔ ان پر دلہن کے حسن کی کچھ ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ رات ہی رات جو وہ پورا اپنے نانا کے ہاں بھاگ گئے۔ دبی زبان سے اپنے ہم عمروں سے کہا ”میں شادی نہیں کروں گا۔“ یہ وہ زمانہ تھا جب چوں چرا کرنے والوں کو جوتے سے درست کر لیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ منگنی ہو جائے تو پھر توڑنے کی مجال نہیں تھی۔ ناکس کٹ جانے کا خدشہ ہوتا تھا۔

اور پھر دلہن میں عیب کیا تھا؟ یہی کہ وہ بے انتہا حسین تھی۔ دنیا حسن کی دیوانی ہے اور آپ حسن سے نالاں بد مزاتی کی حد۔

”وہ مغرور ہے۔“ دبی زبان سے کہا۔

”کیسے معلوم ہوا؟“

جب کہ کوئی ثبوت نہیں مگر حسن ظاہر ہے۔ مغرور ہوتا ہے اور کالے میاں کسی کا غرور جھیل جائیں یہ ناممکن۔ ناک پر مکھی بٹھانے کے روادار نہ تھے۔

بہت سمجھایا کہ میاں وہ تمہارے نکاح میں آنے کے بعد تمہاری ملکیت ہو گی۔ تمہارے حکم سے دن کو رات اور رات کو دن کہے گی۔ جدھر بٹھاؤ گے بیٹھے گی اٹھاؤ گے اٹھے گی۔

کچھ جوتے بھی پڑے اور آخر کار کالے میاں کو پکڑ بلایا گیا اور شادی کر دی گئی۔

دو مینوں نے کوئی گیت گا دیا۔ کچھ گوری دلہن اور کالے دولہا کا۔ اس پر کالے میاں پھینکنا اٹھے۔ اوپر سے کسی نے پچھتا ہوا ایک سہرا پڑھ دیا۔ پھر تو بالکل ہی الف ہو گئے۔ مگر کسی نے ان کے طعنے کو سنجیدگی سے نہ لیا۔ مذاق ہی سمجھتے رہے اور چھیڑتے رہے۔

دولہا میاں شمشیر برہنہ بنے جب دلہن کے کمرے میں پہنچے تو لال لال چمکدار



پھولوں میں ابھی سلجھی دلہن دیکھ کر پسینے چھوٹ گئے۔ اس کے سفید ریشمی ہاتھ دیکھ کر خون سوار ہو گیا۔ جی چاہا اپنی سیاہی اس سفیدی میں ایسی گھوٹ ڈالیں کہ امتیاز ہی ختم ہو جائے۔

کانپتے ہاتھوں سے گھونگھٹ اٹھانے لگے تو دلہن بالکل اوندھی ہو گئی۔  
 ”اچھا تم خود ہی گھونگھٹ اٹھاؤ۔“

دلہن اور نیچے جھک گئی۔  
 ”ہم کہتے ہیں۔ گھونگھٹ اٹھاؤ۔“ ٹپٹ کر بولے۔  
دلہن بالکل گیند بن گئی۔

”اچھا جی اتنا غرور!“ دولہا نے جوتے اتار کر بغل میں دبائے اور پائیں باغ والی کھڑکی سے کود کر سیدھے اسٹیشن، پھر جودھ پورا!

اس زمانے میں طلاق ولاق کا فیشن نہیں چلا تھا۔ شادی ہو جاتی تھی۔ تو بس ہو ہی جاتی تھی۔ کالے میاں سات برس گھر سے غائب رہے۔ دلہن سسرال اور میکہ کے درمیان معلق رہیں۔ ماں کو روپیہ پیسہ بھیجتے رہے گھر کی عورتوں کو پتہ تھا کہ دلہن ان چھوٹی رہ گئی۔ ہوتے ہوتے مردوں تک بات پہنچی۔ کالے میاں سے پوچھ کچھ کی گئی۔

”وہ مغرور ہے۔“

”کیسے معلوم؟“

”ہم نے کہا گھونگھٹ اٹھاؤ، نہیں سنا۔“

”عجب گاؤدی ہوا ماں کہیں دلہن خود گھونٹ اٹھاتی ہے۔ تم نے اٹھایا

ہوتا۔“

”ہرگز نہیں، میں نے قسم کھائی ہے۔ وہ خود گھونگھٹ نہیں اٹھائے گی تو

چولہے میں جائے۔“

”اماں عجب نامرد ہو۔ دلہن سے گھونگھٹ اٹھانے کو کہتے ہو۔ پھر کہو گے وہ

آگے بھی پیش قدمی کرے اجی لاہول ولاقوہ۔“



گوری بی کے ماں باپ اکلوتی بیٹی کے غم میں گھنے لگے۔ بچی میں کیا عیب تھا کہ دولہا نے ہاتھ نہ لگایا۔ ایسا اندھیر تو نہ دیکھا نہ سنا۔

کالے میاں نے اپنی مردانگی کے ثبوت میں رنڈی بازی، لونڈے بازی، مرغ بازی، کبوتر بازی غرض کوئی بازی نہ چھوڑی اور گوری بی گھونگٹ میں سلگتی رہیں۔ نانی اماں کی حالت خراب ہوئی تو سات برس بعد کالے میاں گھر لوٹے اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر پھر بیوی سے ان کا ملاپ کرانے کی کوشش کی گئی۔ پھر سے گوری بی دلہن بنائی گئیں۔ مگر کالے میاں نے کہہ دیا۔ ”اپنی ماں کی قسم کھا چکا ہوں گھونگٹ میں نہیں اٹھاؤں گا۔“

سب نے گوری بی کو سمجھایا۔ دیکھو بنو ساری عمر کا بھگتان ہے۔ شرم و حیا کو رکھو طاق میں اور جی کڑا کر کے تم آپ ہی گھونگٹ اٹھا دیتا۔ اس میں کچھ بے شری نہیں وہ تمہارا شوہر ہے۔ خدائے مجازی ہے۔ اس کی فرمانبرداری تمہارا فرض ہے۔ تمہاری نجات اس کا حکم ماننے ہی میں ہے۔“

”پھر سے دلہن بھی سچ سجائی پلاؤ زردہ پکا اور دولہا میاں دلہن کے کمرے میں دھکیلے گئے۔ گوری بی اب اکیس برس کی نوخیز حسینہ تھیں۔ انگ انگ سے جوانی پھوٹ رہی تھی۔ آنکھیں بوجھل تھیں۔ سانس بھری تھیں۔ سات برس انہوں نے اسی گھڑی کے خواب دیکھ کر گزارے تھے۔ ہم سن لڑکیوں نے بیسیوں راز بتا کر دل کو دھڑکنا سکھا دیا تھا۔ دلہن کے حنا آلودہ ہاتھ پیر دیکھ کر کالے میاں کے سر پر جن منڈلانے لگے۔ ان کے سامنے ان کی دلہن رکھی تھی۔ چودہ برس کی کچی کلی نہیں ایک مکمل گلہ ستارہ بن چکی تھی۔ آج ضرور دن اور رات مل کر سرگیں شام کا سماں بندھے گا۔ ان کا تجربہ کار جسم شکاری چیتے کی طرح منہ زور ہو رہا تھا۔ انہوں نے اب تک دلہن کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ بدکاریوں میں بھی اس رس بھری دلہن کا تصور دل پر آ رہے چلاتا رہا تھا۔“

”گھونگٹ اٹھاؤ۔“ انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں حکم دیا۔  
دلہن کی چٹنگلی بھی نہ ہلی۔



”گھونگٹ اٹھاؤ۔“ انہوں نے بڑی لجاجت سے روٹی آواز میں کہا۔  
 سکوت طاری ہے۔

”اگر میرا حکم نہیں مانو گی تو پھر منہ نہیں دکھاؤں گا۔“  
 دلہن ٹس سے مس نہ ہوئی۔

کالے میاں نے گھونہ مار کر کھڑکی کھولی اور پائیں باغ میں کود گئے۔  
 اس رات کے گئے وہ پھر واپس نہ لوٹے۔

ان چھوٹی گوری بی تیس سال تک ان کا انتظار کرتی رہیں۔ سب مر کھپ گئے۔ ایک بوڑھی خالہ کے ساتھ فتح پور سیکری میں رہتی تھیں کہ سناؤنی آئی دولہا آئے ہیں۔

دولہا میاں موریوں میں لوٹ پیٹ کر امراض کا پلندہ بنے آخری دم وطن لوٹے۔ دم توڑنے سے پہلے انہوں نے التجا کی کہ گوری بی سے کہو آ جاؤ کہ دم نکل جائے۔

گوری بی کھنبہ سے ماتھا نکائے کھڑی رہیں۔ پھر انہوں نے صندوق کھول کر اپنا تار تار شانہ جوڑا نکالا۔ آدھے سفید سر میں سیاگ کا تیل ڈالا اور گھونگٹ سنبھالتی لب دم مریض کے سرہانے پہنچیں۔

”گھونگٹ اٹھاؤ۔“ کالے میاں نے نزع کے عالم میں سسکی بھری۔  
 گوری بی کے لرزتے ہوئے ہاتھ گھونگٹ تک اٹھے اور نیچے گر گئے۔  
 کالے میاں دم توڑ چکے تھے۔

انہوں نے وہیں اکڑوں بیٹھ کر پٹنگ کے پائے پر چوڑیاں توڑیں اور گھونگٹ کی بجائے سر پر رنڈا پے کا سفید دوپٹہ کھینچ لیا۔





## ہندوستان چھوڑ دو

”صاب مر گیا۔“ جینت رام نے بازار سے سودے کے ساتھ یہ خبر لا کر

دی۔۔۔۔۔

”صاحب! کون صاحب؟“

”وہ کانڑیا صاحب تھا نا۔“

”اوہ کانٹا صاحب۔ جیکسن۔ چہ بے چارا۔“ میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ کائی لگی پرانی جگہ جگہ سے کھونڈی بتیسی کی طرح منہدم ہوتی ہوئی دیوار کے اس پار ادھرے ہوئے سیمنٹ کے چبوترے پر سکھوبائی پیرپارے بھی مراہٹی زبان میں بین کر رہی تھی۔ اس کے پاس پٹوا کڑوں بیٹھا بچکیوں سے رو رہا تھا۔ پٹو یعنی پیٹر کالے گورے میل کا نادر نمونہ تھا اس کی آنکھیں جیکسن صاحب کی طرح نیلی اور بال بھورے تھے۔ رنگ گندی تھا جو دھوپ میں جل کر بالکل تانبے جیسا ہو گیا تھا۔

اسی کھڑکی میں سے میں برسوں سے ایک عجیب و غریب خاندان کو دیکھتی آئی ہوں۔ یہیں بیٹھ کر میری جیکسن سے پہلی مرتبہ بات چیت ہوئی تھی۔ سن بیالیس کا ”ہندوستان چھوڑ دو“ کا ہنگامہ زوروں پر تھا۔ گرانٹ روڈ سے داور تک کا سفر ملک کی بے حسینی کا ایک مختصر مگر جاندار نمونہ ثابت ہوا تھا۔ منگٹن روڈ کے ٹاکے پر ایک بڑا الاؤ جل رہا تھا۔ جس میں راہ پنتوں کی ٹائیاں ہیٹ اور کبھی موڑ آ جاتا تو پتلونیں اتار کر جلائی جا رہی تھیں۔ سین کچھ بچکانہ سی مگر دلچسپ تھا۔ لچھے دار ٹائیاں نئے طرح دار ہیٹ استری کی ہوئی پتلونیں بڑی بے دردی سے آگ میں



جھونکی جا رہی تھیں۔ پھٹے چتھرے پنے آتش باز نے نئے کپڑوں کی نہایت بے تکلفی سے آگ میں جھونک رہے تھے۔ ایک لمحے کو بھی تو کسی کے دل میں یہ خیال نہیں آ رہا تھا کہ نئی گیبرڈین کی پتلون کو آگ کے منہ میں جھونکنے کے بجائے اپنی ننگی سیاہ ٹانگوں پر ہی چڑھالے۔

اتنے میں ملٹری ٹرک آگئی تھی جس میں سے لال بھوکا تھو تھنیوں والے گورے ہاتھوں میں مشین گنیں سنبھالے دھما دھم کودنے لگے۔ مجمع ایک دم پھر سے نہ جانے کہاں اڑ گیا تھا۔ میں نے یہ تماشا میونسپل دفتر کے محفوظ احاطے سے دیکھا تھا اور مشین گنیں دیکھ کر میں جلدی سے اپنے دفتر میں گھس گئی تھی۔

ریل کے ڈبوں میں بھی افراد تفری مچی ہوئی تھی۔ بمبئی سنٹرل سے جب ریل چلی تھی تو ڈبہ کی آٹھ سیٹوں میں سے صرف تین سلامت تھیں۔ لوہے پر ریل تک وہ تینوں بھی اکھیر کر کھڑکیوں سے باہر پھینک دی گئیں۔ اور میں راستہ بھر کھڑی دادر آئی۔ مجھے ان چھو کروں پر قطعی کوئی غصہ نہیں آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا یہ ساری ریلیں، یہ ٹائیاں، پتلونیں ہماری نہیں دشمن کی ہیں۔ ان کے ساتھ ہم دشمن کو بھی بھون رہے ہیں۔ اٹھا کر پھینک رہے ہیں۔ میرے گھر کے قریب ہی سڑک کے پتھوں بیچ ٹریفک روکنے کے لئے ایک پیڑ کا لمبا سا گدھا سڑک پر لمبا لمبا ڈال کر اس پر کوڑے کرکٹ کی اچھی خاصی دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔ میں بمشکل اسے پھلانگ کر اپنے فلیٹ کے دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ ملٹری ٹرک آگئی۔ اور جو پہلا گورا مشین گن لئے دھم سے کودا تھا۔ وہ جیکسن صاحب ہی تھا۔ ٹرک کی آمد کی خبر سنتے ہی سڑک پر روک باندھنے والا دستہ ادھر ادھر بلڈنگوں پر سٹنگ گیا تھا۔

میرا فلیٹ چونکہ سب سے نچلی منزل پر تھا لہذا بہت سے چھو کرے ایک دم ریلا کر کے گھس آئے۔ کچھ باورچی خانہ میں گھس گئے۔ کچھ غسل خانہ اور سنڈاس میں دیک گئے۔

چونکہ میرا دروازہ کھلا تھا اس لئے جیکسن معہ دو مسلح گوروں کے مجھ سے جواب طلب کرنے آگے آیا۔



”تمہارے گھر میں بد معاش چھپے ہیں انہیں ہمارے سپرد کرو۔“  
 ”میرے گھر میں تو کوئی نہیں۔ صرف میرے نوکر ہیں۔“ میں نے بڑی  
لا پرواہی سے کہا۔

”کون ہیں تمہارے نوکر؟“  
 ”یہ تینوں۔۔۔۔۔“ میں نے تین آدمیوں کی طرف اشارہ کیا جو برتن کھڑپڑ  
 کر رہے تھے۔  
 ”غسل خانہ میں کون ہے؟“  
 ”میری ساس نہا رہی ہیں۔“ میری ساس نہ جلتے اس وقت کہاں ہوں  
 گی۔“

”اور پاخانہ میں۔“ اس کے چہرے پر کچھ شرارت کی جھپکی آئی۔  
 ”میری ماں ہوں گی یا شاید بہن ہو۔ مجھے کیا پتہ میں تو ابھی باہر سے آئی  
 ہوں۔“

”پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا غسل خانہ میں تمہاری ساس ہے؟“  
 ”میں داخل ہوئی تو انہوں نے آواز دے کر تولیہ مانگا تھا۔“  
 ”ہوں۔۔۔۔۔“ اچھا اپنی ساس سے کہ دو سڑک روکنا جرم ہے!“ اس نے  
 دبی آواز میں کہا اور اپنے ساتھیوں کو جنہیں وہ باہر کھڑا کر آیا تھا واپس رُک میں  
 جانے کو کہا۔

”ہوں۔۔۔۔۔! ہوں ہوں۔“ وہ گردن ہلا کر مسکراتا ہوا چلا گیا۔ اس کی  
آنکھوں میں پر معنی جگنو چمک رہے تھے۔

جیکسن کا بنگلہ میرے احاطے سے محلّہ زمین پر تھا۔ مغربی رخ پر سمندر تھا۔  
 اس کی میم صاحب مع دو بچوں کے ان دنوں ہندوستان آئی ہوئی تھی۔ بڑی لڑکی  
 جوان تھی اور چھوٹی بارہ تیرہ برس کی۔ میم صاحب صرف چھٹیوں میں تھوڑے دنوں  
 کے لئے ہندوستان آ جاتی تھی۔ اس کے آتے ہی بنگلہ کا حلیہ بدل جایا کرتا تھا۔ نوکر  
 چاق و چوبند ہو جاتے۔ اندر باہر تپائی جاتی۔ باغ میں نئے گملے میا کئے جاتے۔ جو







چاہا اس کا منہ نوچ لوں اس کی کون سی آنکھ شیشے کی تھی۔ یہ اندازہ لگانا میرے لئے مشکل تھا کیونکہ وہ شیشے والی آنکھ دلائی فنکاری کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ اس میں ساری جیکسن کی سفید قوم کی چالبازی بھری ہوئی تھی۔ احساس برتری کا زہر دونوں ہی آنکھوں میں برابر رچا ہوا تھا۔ میں نے دھڑے کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے۔

مجھے سکھوبائی پر غصہ آتا تھا۔ سور کی بچی سفید قوم کے ذلیل کتے کا تر نوالہ بنی ہوئی تھی۔ کیا خود اس ملک کے کوڑھیوں اور حرامزادوں کی کمی تھی۔ جو وہ ملک کی غیرت کے غلام پر تل گئی تھی ہر روز جیکسن شراب پی کر اس کی ٹھکائی کرتا۔ ملک میں بڑے بڑے معرکے سر کئے جا رہے تھے۔ سفید حاکم بس چار دنوں کے مہمان تھے۔

”بس اب چل چلاؤ ہے ان کی حکومت کا۔“ کچھ لوگ کہتے۔  
 ”اجی ہ شیخ چلی کے خواب ہیں۔ انہیں نکالنا مذاق نہیں۔“ دوسرے لوگ کہتے اور میں ملک کے نیتاؤں کی لمبی چوڑی تقریریں سن کر سوچتی۔ ”کوئی جیکسن کا نے صاحب کا ذکر ہی نہیں کرتا۔ وہ مزے سے سکھوبائی کے جھوٹے پکڑ کر پیٹتا ہے۔ فلوینا اور پنو کو مارتا ہے۔ جے ہند کے نعرے لگانے والے اس کم بخت کا کچھ فیصلہ کیوں نہیں کرتے۔“

مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ پچھواڑے شراب بنتی تھی۔ مجھے معلوم تھا۔ سب کچھ مگر میں کیا کر سکتی تھی۔ سنا تھا کہ اگر ان غنڈوں کی رپورٹ کر دو۔ تو یہ جان کئے لاگو ہو جاتے ہیں۔ ویسے مجھے یہ بھی تو نہیں معلوم تھا کہ کس سے رپورٹ کروں۔ ساری بلڈنگ کے غل دن رات ٹپکتے تھے۔ موریوں سڑ رہی تھیں۔ مگر مجھے قطعی نہیں معلوم تھا کہ کہاں اور کس سے رپورٹ کی جاتی ہے۔ آس پاس رہنے والوں میں بھی کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اگر کوئی بذات عورت اوپر سے سر پر کوڑے کا ٹین الٹ دے تو اس کی کس سے شکایت کرو۔ ایسے موقعوں پر عموماً ”جس کے سر پر کوڑا گرتا وہ منہ اونچا کر کے کھڑکیوں کو گالیاں دیتا ہے“ کپڑے جھاڑتا اپنی راہ لیتا۔



میں نے موقع پا کر ایک دن سکھوبائی کو پکڑا۔  
 ”کیوں کم بخت! یہ پاجی تمہیں روز بیٹتا ہے تجھے شرم بھی نہیں آتی۔“  
 ”روح کبھی مارتا بائی؟“ وہ بحث کرنے لگی۔  
 ”خیر وہ مہینے میں چار پانچ دفعہ تو مارتا ہے نا!“  
 ”ہاں مارتا ہے بائی۔۔۔۔۔ سو ہم بھی سالے کو مارتا ہے۔“ وہ ہنسی۔  
 ”چل جھوٹی۔“

”ارے پنو کا سوگند۔۔۔۔۔ ہم تھوڑا مار دیا سالا کو پرسوں؟“  
 ”مگر تجھے شرم نہیں آتی، یہ سفید چمڑی والے کی جوتیاں سہتی ہے؟“ میں  
 نے ایک بچے وطن پرست کی طرح جوش میں آ کر لکچر دے ڈالا۔ ”ان لٹیروں نے  
 ہمارے ملک کو کتنا لوٹا ہے۔“ وغیرہ وغیرہ۔

”ارے بائی کیا بات کرتا تم۔ صاب سالا کوئی کو نہیں لوٹا۔ یہ جو موالی لوگ  
 ہے نا یہ بیچارا کو دن رات لوٹتا۔ میم صاحب گیا۔ پیچھے سب کنٹری بھٹاری پیرا لوگ  
 پار کر دیا۔ اکھا پائلوں کوٹ ہیٹ، اتنا فرسٹ کلاس جوتا۔۔۔۔۔ سب  
 گھٹم۔۔۔۔۔ دیکھو چل کے بنگلے میں کوچہ بھی نہیں چھوڑا۔ تم کہتا ہے چور ہے  
 صاب، ہم بولتا ہم نہیں ہووے تو سالا اس کا بوٹی کاٹ کے جاوے اے لوگ۔“  
 ”مگر تمہیں کیوں اس کا اتنا درد ہے؟“

”کانیکو نہیں ہووے درد وہ ہمارا مرد ہے نا بائی۔۔۔۔۔ سکھوبائی مسکرائی۔  
 ”اور میم صاحب؟“

”میم صاحب سالی پکی چھنال ہاں۔۔۔۔۔!“ سکھوبائی نے فیصلہ کیا۔ ”ہم  
 اس کو اچھی طرح جانتا۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ لندن میں اس بوت تار ہے۔“ یہاں  
 سکھوبائی نے موٹی سی گالی دے کر کہا۔ ”وہیں مری رہتی ہے۔ آتی بھی نہیں پن  
 آتی تو اکھا دن صاحب سے کھٹ کھٹ۔ نوکر لوگ سے کھٹ کھٹ۔“

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اب انگریز ہندوستان سے جا رہے  
 ہیں۔ صاب بھی چلا جائے گا۔ مگر وہ قطعی نہیں سمجھی۔ یہی کہتی رہی۔



”صاب ہم کو چھوڑ کے کیا جائے گا۔۔۔۔۔ بائی اس کو ہلاکت ایک دم پسند نہیں۔“

کچھ سال کے لئے مجھے پونا رہنا پڑا۔ اس عرصے میں دنیا بدل گئی۔ پھر واقعی انگریز چلے گئے۔ ملک کا ہزارہ ہوا۔ سفید حاکم پٹی ہوئی چال چل گیا اور ملک خون کی لہروں میں نہا گیا۔

جب بمبئی واپس آئی تو بنگلہ کا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ صاحب نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ بنگلے میں ایک ریفریجری خاندان آ بسا تھا۔ باہر نوکروں کے کوارٹروں میں سے ایک کو ٹھری میں سکھوبائی رہنے لگی تھی۔ فلوینا خاصی لمبی ہو گئی تھی۔ پٹو اور وہ ماہم کے قریب ایک یتیم خانے میں پڑھنے جاتے تھے۔

جیسے ہی سکھوبائی کو میرے آنے کی خبر ملی فوراً ہاتھ میں دو چار مونگنے کی پھلیاں لئے آن دھمکی۔

”کیسا ہے بائی؟“ اس نے رسماً میرے گھٹنے دبا کر پوچھا۔

”تم کیسا ہے۔۔۔۔۔ صاحب کہاں ہے تمہارا؟ چلا گیا نالندہن!“

”نہیں بائی۔“ سکھوبائی کا منہ سوکھ گیا۔ ”ہم بولا بھی جانے کو پر نہیں گیا۔“ اس کا نوکری بھی کھلاس ہو گیا تھا۔ آرڈر بھی آیا پر نہیں گیا۔ ”پھر وہ گیا کہاں؟“

”ہسپتال میں!“

”کیوں کیا ہو گیا؟“

”ڈاکٹر لوگ بولتا۔۔۔۔۔ کہ دارو بہت پیا۔ اس کے کارن مستک پھر پھر

گیا۔ ادھر پاگل صاب کا ہسپتال ہے۔ اچا ایک دم فرسٹ کلاس ادھر اس کو ڈالا۔“

”مگر وہ تو واپس جانے والا تھا۔“

”کتنا سب لوگ بولا ہم بھی بولا۔۔۔۔۔ بابا چلا جاؤ۔“ سکھوبائی رو پڑیں

”پن نہیں۔ ہم کو بولا سکھو ڈانگ تیرے کو چھوڑ کر نہیں جائے گا۔“

نہ جانے سکھوبائی کو روتے دیکھ کر مجھے کیا ہو گیا۔ میں بالکل بھول گئی کہ



صاحب ایک غاصب قوم کا فرد ہے جس نے فوج میں بھرتی ہو کر میرے ملک کی غلامی کی زنجیروں کو چوہیرا کر دیا تھا۔ جس نے میرے ہموطن بچوں پر گولیاں چلائی تھیں۔ نہتے لوگوں پر مشین گنوں سے آگ برسائی تھی۔ برٹش سامراج کے ان گھناؤنے کلبرزوں میں سے تھا جس نے میرے دیس کے جانبازوں کا خون سڑکوں پر بہایا تھا۔ صرف اس تصور میں کہ وہ اپنا حق مانگتے تھے۔ مگر مجھے اس وقت کچھ یاد نہ رہا۔ سوائے اس کے کہ سکھوبائی کا ”مرد“ پاگل خانہ میں تھا۔ مجھے اپنے جذباتی ہونے پر بہت دکھ تھا کیونکہ ایک قوم پرست کو جابر قوم کے ایک فرد سے قطعی کسی قسم کی ہمدردی یا لگاؤ نہ محسوس کرنا چاہئے۔

میں ہی نہیں سب بھول چکے تھے۔ محلے کے سارے لونڈے نیلی آنکھوں والی فلو مینا پر بغیر یہ سوچے سمجھے فدا تھے کہ وہ کیرا جس سے اس کی ہستی وجود میں آئی سفید تھا یا کالا۔ جب وہ سکول سے لوٹتی تو کتنی ہی ٹھنڈی سانسیں اس کے جلو میں ہوتیں۔ کتنی ہی نگاہیں اس کے پاؤں تلے بچھائی جاتیں۔ کسی لونڈے کو اس کے عشق میں سر دھنتے وقت قطعی یہ یاد نہ رہتا تھا کہ یہ اسی سفید درندے کی لڑکی ہے جس نے ہری نو اس کے ناکے پر چودہ برس کے بچے کو خون میں ڈبو مارا تھا۔ جس نے باہم چرچ کے سامنے نئی عورتوں پر گولیاں چلائی تھیں۔ کیونکہ وہ نعرے لگا رہی تھیں۔

”ہندوستان چھوڑ دو!“

جس نے چوپائی کی ریت میں جوانوں کا خون چوڑا تھا اور سیکرٹریٹ کے سامنے سوکھے مارے ننگے بھوکے لڑکوں کے جلوس کو مشین گنوں سے درہم برہم کیا تھا۔ وہ سب بھول چکے تھے۔ بس اتنا یاد تھا کہ کندنی گالوں اور نیلی آنکھوں والی چھوکری کی کمر میں غضب کی لچک ہے موٹے موٹے گدراے ہوئے ہونٹوں کی جنبش میں موتی رلتے ہیں۔

ایک دن سکھوبائی جھولی میں پر ساد لئے بھاگی بھاگی آئی۔

”ہمارا صاب آگیا۔“ ان کی آواز لرز رہی تھی۔ آنکھوں میں موتی چمک



رہے تھے۔ کتنا پیار تھا۔ اس لفظ ”ہمارا“ میں۔ زندگی میں ایک بار کسی کو یوں جی جان کا دم نہوڑ کر اپنا کہنے کا موقع مل جائے تو پھر جہنم لینے کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔  
”اچھا ہو گیا؟“

”ارے بائی پاگل کبھی تھا؟ ایسا تیج صاحب لوگ پکڑ کر لے گیا تھا۔ بھاگ آیا۔۔۔۔۔“ وہ رازداری کے لہجے میں بولیں۔

میں ڈر گئی کہ لو بھی ایک تو ہارا ہوا انگریز اوپر سے پاگل خانہ سے بھاگا ہو۔ کس کو رپورٹ کروں۔ بمبئی کی پولیس کے لفڑے میں کون پڑتا پھرے۔ ہوا کرے پاگل میری بلا سے۔ کون مجھے اس سے میل جول بڑھاتا ہے۔

لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ مجھے میل جول بڑھانا پڑا۔ میرے دل میں بھی کھدبھد ہو رہی تھی کہ کسی طرح پوچھوں جیکسن انگلستان اپنے بیونی کے پاس کیوں نہیں جاتا۔ بھلا ایسا بھی کوئی انسان ہو گا جو فردوس کو چھوڑ کر یوں ایک کھولی میں پڑا رہے اور ایک دن مجھے موقع مل ہی گیا۔ کچھ دن تک تو وہ کوٹھڑی سے باہر ہی نہ نکلا۔ پھر آہستہ آہستہ نکل کر چوکھٹ پر بیٹھے لگا۔ وہ سوکھ کر چرخ ہو گیا تھا۔ اس کا رنگ جو پہلے بندر کی طرح لال چقدر تھا جھلس کر کٹھی ہو گیا تھا۔ بال سفید ہو گئے تھے۔ چار خانہ کی لنگی باندھے میلا بنیان چڑھائے وہ بالکل ہندوستان کی گلیوں میں گھومتے پرانے گورکھوں جیسا لگتا تھا۔ اس کی نفلی اور اصلی آنکھ میں فرق معلوم ہونے لگا تھا۔ شیشہ تو اب بھی ویسا ہی چمکدار، شفاف اور ”انگریز“ تھا۔ مگر اصلی آنکھ گدلی بے رونق ہو کر ذرا دب گئی۔ عموماً وہ شیشے والی آنکھ کے بغیر ہی گھوما کرتا تھا۔ ایک دن میں نے کھڑکی میں سے دیکھا تو وہ جامن کے پیڑ کے نیچے کھڑا کھوئے کھوئے انداز میں کبھی زمین سے کوئی کنکر اٹھاتا، اسے بچوں کی طرح دیکھ کر مسکراتا پھر پوری طاقت سے اسے دور پھینک دیتا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرانے اور سر ہلانے لگا۔

”کیسے طبیعت ہے صاحب؟“ تجسّس نے اکسایا تو میں نے پوچھا۔

”اچھا ہے۔ اچھا ہے۔“ وہ مسکرا کر شکر یہ ادا کرنے لگا۔

میں نے باہر جا کر ادھر کی باتیں کرنا شروع کیں۔ جلد ہی وہ مجھ سے باتیں



کرنے میں بے تکلفی سی محسوس کرنے لگا۔ پھر ایک دن میں نے موقع پا کر کریدنا شروع کیا۔ کئی دن کی جانفشانی کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک شریف زادی کا ناجائز بیٹا تھا۔ اس کے نانا نے ایک کسان کو کچھ روپیہ دے دلا کر پالنے پر راضی کر لیا۔ مگر یہ معاملہ اس صفائی سے کیا گیا کہ اس کسان کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ وہ کس خاندان کا ہے۔ کسان بڑا جابر تھا۔ اس کے کئی بیٹے تھے جو جیکسن کو طرح طرح سے زک پہنچایا کرتے تھے۔ روز پٹائی ہوتی تھی۔ مگر کھانے کو اچھا ملتا تھا۔ اس نے بارہ تیرہ برس کی عمر سے بھاگنے کی کوشش کرنا شروع کی۔ تین چار سال کی مستقل کوششوں کے بعد وہ لڑھکتا پڑھکتا دھکے کھاتا لندن پہنچا۔ وہاں اس نے دنیا بھر کے پیشے باری باری اختیار کئے۔ مگر اس عرصہ میں وہ اتنا ڈھیٹ مکار اور خود سر ہو گیا تھا کہ دو دن سے زیادہ کوئی نوکری نہ رہتی۔

وہ شکل و صورت کا وجیہ تھا۔ اس لئے لڑکیوں میں کافی ہر دل عزیز تھا۔ ڈار تھی اس کی بیوی بڑے نک چڑھے خاندان کی لڑکی تھی۔ کم رو اور کم ظرف بھی تھی۔ اس کا باپ بار سوخ آدمی تھا۔ جیکسن نے سوچا اس خانہ بدوشی کی زندگی میں بڑے جھنجھٹ ہیں۔ آئے دن پولیس اور کچھری سے واسطہ پڑتا ہے۔ کیوں نہ ڈار تھی سے شادی کر کے عاقبت سنوار لی جائے۔

ڈار تھی اس کے باپ کی بیٹی اس کی دسترس سے باہر تھی وہ اونچی سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے کی عادی تھی مگر جیکسن کی اس وقت دونوں آنکھیں کھلی اصلی تھیں یہ تو جب ڈار تھی سے لڑ کر وہ شرابخانیوں کا ہو رہا وہاں کسی سے مار پیٹ میں آنکھ جاتی رہی۔ جب تک اس کی صرف بڑی بیٹی پیدا ہوئی تھی۔

”ہاں تم نے ڈار تھی کو کیسے گھیر کر پھانسا۔۔۔۔۔؟“ میں نے اور کریدا۔

”جب میری دونوں آنکھیں سلامت تھیں۔“ جیکسن مسکرایا۔

کسی نہ کسی طرح ڈار تھی سے تھے چڑھ گئی۔ کم بخت کنواری بھی نہیں تھی مگر ایسے فیل میچائے کہ باپ کی مخالفت کے باوجود شادی کر لی۔ شاید وہ اپنی شادی سے ناامید ہو چکی تھی اور خود اس کی گھاٹ میں تھی۔



باپ نے بھی لڑکی کی مجبوریوں کو سمجھ لیا۔ نیز بیوی کے روز روز کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اسے ہندوستان بھیجوا دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہر انگریز ہندوستان کے سرمنڈھ دیا جاتا تھا۔ خواہ وہاں وہ جوتے گانٹھتا ہو یہاں آتے ہی صاحب بن بیٹھتا تھا۔

جیکسن نے حد کر دی۔ وہ ہندوستان میں بھی ویسا ہی نکما اور لاابالی ثابت ہوا۔ سب سے بڑی خرابی جو اس میں تھی وہ اس کا چھپھورا پن تھا۔ بجائے صاحب بہادروں کی طرح رعب داب سے رہنے کے وہ نہایت بھونڈے پن سے نیٹو لوگوں میں گھل مل جاتا تھا۔ جب وہ بستی کے علاقے میں جنگلات کے محکمہ میں تعینات ہوا تو وہ کلب کے بجائے نہ جانے کن چند خانوں میں گھومتا پھرتا تھا۔

آس پاس صرف چند انگریزوں کے بنگلے تھے۔ بد قسمتی سے زیادہ تر لوگ معمر اور برباد تھے۔ سنسان کلب میں جہاں ہندوستانیوں اور کتوں کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ زیادہ تر الو بولا کرتا تھا۔ سب ہی افسروں کی بیویاں اپنے وطن میں رہتی تھیں۔ جب کبھی کسی افسر کی بیوی آتی تو وہ اسے بجائے جنگل میں لانے کے خود چھٹی لے کر شملہ یا مینی تال چلا جاتا۔ پھر بیوی ہندوستان کی غلاظت سے عاجز آ کر واپس چلی جاتی۔ اور اس کا صاحب ٹھنڈی آہیں بھرتا بیوی کی حسین یاد لئے لوٹ آتا۔ صاحب لوگ ویسے اپنا کام نیٹو عورتوں سے چلا لیا کرتے تھے۔ اس قسم کے تعلقات سے کسی کا بھی نقصان نہیں ہوتا تھا۔ حساب بھی سستا رہتا تھا۔ ہندوستان کا بھی فائدہ تھا۔ اس میں ایک تو ان سے پیدا ہونے والی اولاد بادامی اور کبھی خاصی گوری پیدا ہوتی تھی، اور کپیران کے بار سوخ باپ ان کے لئے یتیم خانے اور اسکول بھی کھول دیتے تھے۔ سرکاری خرچہ پر ان کی دوسرے ہندوستان سے بہتر تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ یہ انیگوانڈین خوش شکل طبقہ انگریزوں سے بس دوسرے نمبر پر تھا۔ لڑکے ریلوے، جنگلات اور نیوی میں بڑی آسانی سے کھپ جاتے تھے۔ جو معمولی شکل کی لڑکیاں ہوتیں انہیں ہندوستانی لڑکیوں کے مقابلے میں بہتر نوکریاں مل جاتیں اور وہ اسکولوں، دفتروں اور ہسپتالوں کی رونق بڑھاتیں۔ جو زیادہ حسین



ہو تیں وہ بڑے بڑے شہروں کے مغرب زدہ بازار حسن میں بڑی کامیاب ثابت ہوتی تھیں۔

جیکسن صاحب جب ہندوستان آیا تو اس میں کانے شخص کے تمام عیب بڑی افراط سے موجود تھے۔ شراب اس کی عادت ثانی بن چکی تھی۔ ہر جگہ اس کی کسی نہ کسی سے جھج چل جاتی اور اس کا تبادلہ ہو جاتا۔ جنگلات سے ہٹا کر اسے پولیس میں بھیج دیا گیا۔ جس کا اسے بہت ملال تھا۔ کیونکہ وہاں ایک پہاڑن پر اس کا بے طرح دل آگیا تھا۔ جبپور پہنچ کر وہ اسے ضرور بلوا لیتا مگر وہاں سے ایک نمٹی سے عشق ہو گیا۔ ایسا شدید عشق کہ اس کی بیوی ساری چھٹیاں نمٹی تال میں گزار کر واپس چلی گئی اور وہ نہ گیا۔ کام کی زیادتی کا بہانہ کرتا رہا۔ چھٹی نہ ملنے کا عذر کیا۔ مگر ڈار تھی کے ڈیڈی کے کتنے ہی دوست تھے جن کی رسوخ کی وجہ سے اسے زبردستی چھٹی دلوائی گئی۔ جب وہ نمٹی تال پہنچا تو اس کا دل وہاں قطعی نہ لگا۔ ایک تو ڈار تھی اس کی جدائی میں اس پر بے طرح عاشق ہو گئی تھی اور چاہتی تھی دوبارہ ہنی مون منایا جائے۔ دوسری طرف اسے جیکسن کے طریقہ عشق سے بڑی وحشت ہوتی تھی۔ وہ اتنے دن ہندوستان میں رہ کر بالکل ہی اجنبی ہو چکا تھا۔ پہاڑن اور نمٹی دونوں نے اس کی ہندوستانی پتی ورتا استریوں کی طرح خدمت کر کے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔

سال میں صرف دو مہینہ کے لئے آنے والی بیوی بالکل اجنبی ہو گئی تھی۔ پھر اس کے سامنے جیکسن کو تکلفات برتنا پڑتے تھے۔

ایک دن نشہ میں اس نے کچھ پہاڑن اور نمٹی کے انداز محبت کا اپنی بیوی سے بھی مطالبہ کر دیا۔ وہ ایسی چراغ پا ہوئی کہ جیکسن کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے بہت جرح کی بہت کریدا کہ ”کیس تم بھی دوسرے بے غیرت اور بیچ انگریزوں کی طرح لوکل عورتوں سے میل جول تو نہیں بڑھانے لگے ہو۔“ جیکسن نے قسمیں کھائیں اور ڈار تھی کے اتنے پیار لئے کہ وہ اس کی پارسائی کی قائل ہو گئی۔ اسے بڑا ترس آیا اور بڑے اصرار سے وہ اسے جبپور لے آیا۔ مگر وہ وہاں کی مکھیوں اور



گرمی سے بوکھلا کر نیم پاگل ہو گئی۔ اور تو سب جھیل جاتی مگر جب اس کے غسل خانے میں دو موئی نکلی تو وہ اسی وقت سامان باندھنے لگی۔ جیکسن نے بہت سمجھایا کہ یہ سانپ نہیں اور کاٹا بھی نہیں مگر اس نے ایک نہ سنی اور دوسرے دن دہلی چلی گئی۔

وہاں سے اس نے زور لگا کر اس کا تبادلہ بمبئی کروا دیا۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب دوسری جنگ شروع ہو چکی تھی۔ نٹنی کی جدائی اور ڈار تھی کا بمبئی میں مستقل قیام سویان روح بن گیا۔ سکھوبائی بچوں کی آیا کا ہاتھ بٹانے کے لئے رکھی گئی تھی۔ مگر جب بارش سے جی چھوڑ کر ڈار تھی مع بچوں کے وطن گئی تو جیکسن کی نظر عنایت اس پر پڑی۔ اف کس قدر ابھی ہوئی داستان تھی صاحب کی۔ کیونکہ سکھوبائی اصل میں گنپت ہیڈ بیرے کی رکھیلی عورت تھی وہ اسے پون پل سے پھسلا لایا تھا۔ ویسے بیوی بچوں والا آدمی تھا۔ بوجھ سے بچنے کے لئے اسے بطور کمائن کے بچوں کے آیا کے نیچے رکھوا دیا تھا۔ سکھوبائی اپنی اس نوکری سے جس میں زمین پونچھے برتن دھونے کے علاوہ گنپت کے ناز اٹھانا بھی شامل تھا۔ کافی مطمئن تھی۔ گنپت اسے کبھی اپنے کسی دوست کو بھی ازراہ کرم یا قرضہ کے عوض میں دے دیا کرتا تھا۔ مگر بڑی چالاکی سے کہ بہت دن تک سکھوبائی کو بھی پتہ نہ چلا۔ وہ پینے سے تو پہلے ہی کچھ واقف تھی۔ گنپت کی صحبت میں پابندی سے شام کو ٹھرا چڑھانے لگی۔ گنپت گاہک کو اپنی کوٹھڑی میں لے آتا۔ جیکسن کا ڈر تو کسی کو تھا نہیں۔ سب کام کاج چھوڑ کر نوکر مزے سے جوا کھیلتے، ٹھرا پیتے بلکہ سارے شیوا جی پارک کے غنڈے ڈار تھی کے جاتے ہی صاحب کے بنگلے پر ٹوٹ پڑتے اور رات گئے تک ہلڑ مچا رہتا۔

شراب جب خوب چڑھ جاتی ہے تو وہ سکھوبائی کو اس آدمی کے پاس چھوڑ کر کسی بہانے سے چلا جاتا۔ سکھوبائی سمجھتی کہ وہ گنپت کو الو بنا رہی ہے اور آہستہ آہستہ وہ صاحب کی خدمت کرتے کرتے بیوی کی عوض بھی بھگتنے لگی۔ اسی طرح گنپت کے چکر سے چھٹی ملی۔ وہ کم بخت الٹا اس کی ساری تنخواہ اینٹھ لیا کرتا تھا۔



ان ہی دنوں گنپت فوج میں سے بیرے کی حیثیت سے مڈل ایسٹ چلا گیا اور سکھو بائی مستقل میم صاحب کی جگہ جم گئی۔ بس جب چھٹیوں میں میم صاحب آتی تو وہ اپنی کھولی میں منتقل ہو جاتی۔ اور جب وہ اپنی پتلی کوک دار آواز میں۔۔۔۔۔

”آلو۔ دود۔۔۔۔۔“ پکارتیں تو وہ فوراً سب کام چھوڑ چھاڑ کے۔

”یس میم صاحب“ کہہ کر لپکتی۔ یوں تو میم صاحب سیکھ کر وہ اپنے آپ کو بڑی انگریزی دان سمجھنے لگی تھی۔ انگریزی زبان میں یس۔ نو۔ ڈیم فول سو آئین کے سوا اور ہے ہی کیا؟“

حاکموں کا ان چند الفاظ میں ہی کام نکل جاتا ہے۔ لمبے چوڑے ادبی جملوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تاںکہ کے گھوڑے کو ٹخ ٹخ اور چابک کی زبان ہی کافی ہوتی ہے۔ مگر سکھو بائی کا یہ نہیں معلوم تھا کہ انگریز کی گاڑی میں ”جتا ہوا مرل گھوڑا“ الف ہو کر گاڑی لوٹ چکا تھا اور اب اس کی لگائیں دوسرے ہاتھوں میں تھیں اس کی دنیا بڑی محدود تھی وہ خود اس کے دو بچے اور اس کا ”مرد!“

جب میم صاحب ہندوستان آیا کرتی تھی۔ جب بھی سکھو بائی بڑی فراخ دلی سے عیوضی چھوڑ کر پھر نینی کے ساتھ کے نیچے کام کرنے لگتی۔ اسے میم صاحب سے قطعی کوئی حسد نہیں تھا۔ میم صاحب مغربی حسن کا نمونہ ہو تو ہو۔ ہندوستانی معیار حسن کے ترازو میں اسے تولا جاتا تو جواب صفر ملتا۔ اس کی جلد کھرچے ہوئے شلغم کی طرح کچی کچی تھی۔ جیسے اسے پوری طرح پکنے سے پہلے ڈال سے توڑ لیا گیا ہو۔ یا ٹھنڈی بے جان اندھیری قبر میں برسوں دفن رکھنے کے بعد نکالا ہو۔ اس کے چھدرے میلی چاندی کے رنگ کے بال بالکل بوڑھیوں کے بالوں کی طرح لگتے تھے۔ اس لئے سکھو بائی کے درجے کے لوگ اسے بڑھیا سمجھتے تھے یا پھر سورج مکھی جسے ہندوستان میں بڑا قابل رحم سمجھا جاتا ہے۔ ”جب وہ منہ دھوئے ہوتی تو اس کی پنسل سے بنائی ہوئی بھنویں غائب ہوتیں۔ چہرہ ایسا معلوم ہوتا گویا کسی نے تصویر کو سستے ربڑ سے بگاڑ دیا ہو۔“

پھر ڈار تھی سرد تھی، اجنبی تھی۔ بیکسن کا وجود اس کے لئے ایک گھناؤنی







سب ہی لوگوں کو بے چینی سی ہوتی تھی۔

”جاسوس ہے“ اسے جان بوجھ کر یہاں رکھا گیا ہے تاکہ یہ ملک میں دوبارہ برطانوی راج کو لانے میں مدد دے۔ ”کچھ لوگ یوں بھی سوچتے۔ گلی کے لونڈے جب وہ دکھائی دیتا، یہی پوچھتے۔

”صاب ولایت کب جائے گا؟“

”صاب کوئٹہ انڈیا ہے کوئٹہ نہیں کرتا؟“

”ہندوستان چھوڑ دو صاب!“

”انگریزی چھوڑا چلا گیا۔“

”وہ گورا گورا چلا گیا۔“

”پھر تم کائے کو نہیں جانتا؟ سڑک پر آوارہ گھومنے والے لونڈے اس کے پیچھے دھیری لگاتے آواز کتے۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ ہوں۔۔۔۔۔ ہوں۔۔۔۔۔ جائے گا۔۔۔۔۔ جائے گا بابا!“ وہ سر ہلا کر مسکراتا اور اپنی کھولی میں چلا جاتا۔

تب مجھے اس کے اوپر بڑا ترس آتا۔ کہاں ہیں دنیا کے رکھوالے جو ہر کمزور ملک کو تہذیب سکھاتے پھرتے ہیں۔ ننگوں کو تیلون اور فراکیں پہناتے پھرتے ہیں۔ اپنے سفید خون کی برتری کا ڈھول پیٹتے ہیں۔ ان کا ہی خون ہے جو جیکسن کے روپ میں کتنا ننگا ہو چکا ہے۔ مگر اسے کوئی مشنری ڈھانکنے نہیں آتا۔

اور جب گلی کے لفنگے تھک ہار کر چلے جاتے تو وہ اپنی کھولی کے سامنے بیٹھ کر بیڑی پیا کرتا۔ اس کی اکلوتی آنکھ دور افق پر اس ملک کی سرحدوں کو تلاش کرتی جہاں نہ کوئی گورا ہے۔ نہ کالا نہ کوئی زبردستی جاسکتا ہے۔ نہ آسکتا ہے اور نہ وہاں بدکار مائیں اپنے ناجائز بچوں کو تیری میری چوکھٹ پر جن کو خود اپنی باوقار دنیا بسا لیتی ہیں۔

سکھوبائی آس پاس کے گھروں میں کماٹین کا کام کرتی۔۔۔۔۔ اچھا خاصا کما لیتی۔ اس کے علاوہ وہ بانس کی ڈلیاں، میز کرسی وغیرہ بنا لیتی تھی۔ اس ذریعہ سے کچھ



آمدنی ہو جاتی۔ بیکنس بھی اگر نشے میں نہ ہوتا تو الٹی سیدھی بے پندے کی ٹوکریاں بنایا کرتا۔ شام کو سکھو بائی اس کے لئے ایک ٹھرے کا ادھالا دیتی جو وہ فوراً چڑھا جاتا اور پھر اس سے لڑنے لگتا۔ ایک رات اس نے نہ جانے کہاں سے ٹھرے کی پوری بوتل حاصل کر لی اور ساری رات پیتا رہا۔ مسجد میں کھولی کے آگے پڑ کر سو گیا۔ فلو مینا اور پنو اس کے اوپر سے پھلانگ کر اسکول چلے گئے۔ سکھو بائی بھی تھوڑی دیر اسے گالیاں دے کر چلی گئی۔ دوپہر تک وہ وہیں پڑا رہا۔ شام کو جب بچے آئے تو وہ دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھا تھا۔ اسے شدید بخار تھا جو دوسرے دن بڑھ کر سرسام کی صورت اختیار کر گیا۔

ساری رات وہ نہ جانے کیا براتا رہا۔ نہ جانے کسے کسے یاد کرتا رہا شاید اپنی ماں کو جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جو اس وقت کسی شاندار ضیافت میں شریک ”اخلاقی اصلاح بندی“ پر کر رہی ہو گی۔ یا وہ باپ یاد آ رہا ہو جس نے نسل چلانے والے سائنڈ کی خدمت ادا کرنے کے بعد اسے اپنے جسم سے بھی ہوئی غلاظت سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ اور جو اس وقت کسی دوسرے محکوم ملک میں بیٹھا قومی اقتدار قائم کرنے کے منصوبے بنا رہا ہو گا۔ یا ڈار تھی کے طعنوں بھرے احسان یاد آ رہے تھے۔ جو بے رحم کسان کے ہنٹروں کی طرح ساری عمر اس کے احساسات پر برستے رہے یا شاید وہ گولیاں جو اس کی مشین گن سے نکل کر بے گناہوں کے سینوں کے پار ہوئیں اور آج پلٹ کر اسی کی روح کو ڈس رہی تھیں۔ وہ رات بھر چلاتا رہا سر پٹختا رہا سینے کی دھونکنی چلتی رہی۔ در و دیوار نے پکار پکار کر کہا۔

”تیرا کوئی ملک نہیں۔۔۔۔۔ کوئی نسل نہیں۔۔۔۔۔ کوئی رنگ نہیں۔“

”تیرا ملک اور نسل سکھو بائی ہے جس نے تجھے بے پناہ پیار دیا کیونکہ وہ بھی اپنے دیس میں غریب الوطن ہے۔ بالکل تیری طرح۔ ان کروڑوں انسانوں کی طرح جو دنیا کے ہر کونے میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ نہ ان کی ولادت پر شادیانے بکتے ہیں نہ موت پر ماتم ہوتے ہیں!“

”پو پھٹ رہی تھی۔ ملوں کی چمنیاں دھواں اگل رہی تھیں اور مزدوروں کی



قطاروں کو نکل رہی تھیں۔ تھکی ہاری رینڈیاں اپنے رات بھر کے خریداروں کے چنگل سے پنڈا چھڑا کر انہیں رخصت کر رہی تھیں۔

”ہندوستان چھوڑ۔“

”کوئٹہ انڈیا۔“

طعن اور نفرت میں ڈوبی آوازیں اس کے ذہن پر ہتھوڑوں کی طرح پڑ رہی تھیں۔ اس نے ایک بار حسرت سے اپنی عورت کی طرف دیکھا جو وہیں پٹی پر سر رکھ کر سو گئی تھی۔ نکومیا رسوئی کے دروازے میں ٹاٹ کے ٹکڑے پر سو رہی تھی۔ اپنا اس کی کمر میں منہ گھسائے پڑا تھا۔ کلیجے میں ایک ہوک سی اٹھی اور اس کی اصلی آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر میلی دری میں جذب ہو گیا۔

برطانوی راج کی مٹی ہوئی نشانی ایرک ولیم جیکسن نے ہندوستان چھوڑ دیا۔





## روشن

اصغری خانم،، اتوں میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ ایک تو دین و دھرم کے معاملے میں اور دوسرے شادیاں کروانے میں۔۔۔۔۔ ان کی بزرگی اور پارسائی میں تو کسی شے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ سب کو یقین تھا کہ انہوں نے اتنی عبادت کی ہے کہ جنت میں ان کے لئے ایک شاندار اور زمرد کا محل ریزہ ہو چکا ہے۔ حوریں اور فرشتے وہاں ان کی راہ دیکھ رہے ہیں کہ کب خدا کا حکم ہو اور وہ وضو کا بدھنا جائے نماز اور تسبیح سنبھالے برقع پھڑکائے جنت کی دہلیز پر ڈولی سے اتریں۔ اور وہ انہیں دودھ اور شہد کی نہروں میں تیرا کر پتے اور بادام کے گھنے درختوں کی چھاؤں میں ٹھلاتے ہوئے زمرد کے محل میں بٹھا دیں اور ان کی سیوا پر جٹ جائیں۔

اصغری خانم کا غصہ ہمیشہ تاک پر دھرا رہتا تھا۔ اگر ذرا بھی کسی جنتی بیوی نے چپیں چیز کی تو وہ اس کی سات پشت کے مردے اکھاڑنے لگیں گی اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے گی اور دوزخ کی آگ کی پناہ لے گی۔

دور دور خانم کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ انہیں ساری دنیا کا کچا چٹھا معلوم تھا۔ مجال تھی جو کوئی ان کے سامنے بڑھ چڑھ کر بولے۔ غازی پور سے لے کر لندن تک کی ہر بدکار عورت کا بھید جانتی تھیں۔

”اے ہے کوئی بیاہی تیاہی ڈہڈونے لگوڑے بادشاہ کو پھانس لیا۔“ وہ مسر مسن اور ایڈورڈ ہشتم کے عشق پر تبصرہ کرتیں۔ ”منہ جلی کو لاج بھی تو نہ آئی۔ میرا بس چلتا تو تختہ صمی (جس نے تین ٹھم کئے ہوں) کا چونڈا جھلس دیتی۔“



مگر مصیبت یہ تھی کہ ان کا بس نہیں چل سکتا تھا۔ لڑکھات سمندر پار تھا۔ اور ان کو گھٹنوں میں آئے دن ٹیس اٹھتی رہتی تھیں۔ چونڈا جھلنے کیسے جاتیں۔ اتنا دم ہوتا تو حج نہ کرتیں۔

مگر شادیاں کرانے میں تو وہ ایسے ایسے معرکے مار چکی تھیں کہ دنیا میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ قریب قریب ناممکن قسم کی شادیاں کرانے کا انہوں نے ریکارڈ قائم کر دیا۔ جسے وہ خود ہی آئے دن توڑا کرتی تھیں۔ بس اسی وجہ سے لوگ ان کی بڑی آؤ بھگت کیا کرتے تھے۔ کنواریاں کس گھر کا بوجھ نہیں ہوتیں۔ جس گھر میں چلی جاتیں۔ لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے سر جھکا کر ان کی گالیاں، کوسنے، طعنے، معنے سنتے۔ انہوں نے ایسی ایسی ڈراؤنی شکل کی لڑکیوں کے نصیب کھولے تھے کہ لوگوں پر ان کی ہیبت بیٹھ گئی تھی خاص طور پر یہ کنوارے لڑکے تو ان سے کانپتے تھے۔ جیسے وہ موت کا فرشتہ ہوں نہ جانے کس پر مہربان ہو جائیں اور اپنے بنوے میں سے کوئی بچھل پائی نکال کر سر پر منڈھ دیں۔ جہاں کوئی شادی کے لائق نظر پڑ جاتی وہ پنچے جھاڑ کر اس کے ماں باپ اور سارے محلے ٹوے والوں کے پیچھے لگ جاتیں اور شادی کے قبل لڑکے تھرا اٹھتے مگر وہ شادی کرا کے ہی دم لیتیں۔ کچھ ایسا پینترا چلتیں کہ الٹا لڑکا دہلیز پر ٹاک رگڑنے لگتا۔ لوگوں کا کہنا تھا ان کے قبضے میں جنات ہیں جو ان کا ہر حکم بجالاتے ہیں۔

مگر ایک جگہ ان کے سارے ہتھیار کند ثابت ہوئے۔ تمام تعویذ گنڈے چوہٹ ہو گئے۔ ان کی اپنی ممیری بہن توفیق جہاں کی بیٹی صبیحہ کو چوبیسواں سال لگ چکا تھا اور ابھی تک کوار کو ٹل چنا ہوا تھا۔ اس سے چھوٹی عقیدہ منگی ہوئی تھی۔ عقیدہ کی پیٹھ کی میمونہ کالج میں پڑھتی تھی۔ سب سے چھوٹی منو تھی۔

قبر کے بھی چار کونے ہوتے ہیں۔ توفیق جہاں کی قبر چنی کھڑی تھی۔ آج تک خاندان میں نہ کوئی باہر کی لڑکی آئی تھی نہ گئی تھی۔ کھرے سیدوں کے گھرانے کو داغ لگانے کی کسے ہمت تھی۔ لڑکوں کا تو دن بدن کال پڑتا جا رہا تھا۔ کسی کی تنخواہ ٹھیک ہے تو ہڈی میں کھوٹ، کوئی کمبوا ہے تو کوئی پٹھان۔ ایک بیچارے انجینئر



کی شامت آئی۔ پیغام بھجوا دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ہے ہے موئے انصاری ہیں۔  
اصغری خانم نے سیتہ گرہ شروع کر دی طوفان کھڑا کر دیا۔ ان کے جیتے جی بیٹی  
انصاریوں میں جائے ایسی بھاری چھاتی کا بوجھ ہے تو کوٹیاں میں ڈال دو۔

یہ جب کی بات ہے جب صبیحہ کو مینھا برس لگا تھا۔ اس کے بعد جب چھ  
برس چھ صدیوں کی طرح چھاتی پر سے دندنا تے گزر گئے تو اصغری خانم کو اپنی پالیسی  
نرم کرنی پڑی اور یہ طے پایا کہ اچھے خاندان کا لڑکا ہو تو کوئی بڑا اندھیر نہیں۔ یہ  
بات بھی نہیں تھی کہ صبیحہ کوئی بد صورت ہو کہ کافی کھتری اور جاہل مرا میاں کا لٹھ  
ہو۔ سانولی سلونی بوٹا سا قد، نازک نازک ہاتھ پیر، کمر سے نیچے جھولتی ہوئی چوٹی،  
سوئی سوئی آنکھیں جن میں قدرتی کاجل بھرا ہوا تھا۔ جی بھر کے دیکھ لو تو نشہ آ  
جائے ہنس دیتی تو موتی سے رل جاتے۔ آواز ایسی میٹھی کہ نوے پڑھتی تو سننے والوں  
کی ہچکی بندھ جاتی۔ اس پر سونے پر سہاگہ علی گڑھ سے پرائیویٹ میٹرک پاس کر چکی  
تھی۔

مگر نصیب کی بات تھی۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ ورنہ کہاں صبیحہ اور  
کہاں روشن۔ بڑے بوڑھے کہتے ہیں۔ عورت مرد کا جوڑا آسمان پر طے ہو جاتا  
ہے۔ اگر صبیحہ اور روشن کا جوڑا بھی آسمان پر طے ہوا تھا تو ضرور کچھ گھپلا ہو گیا۔  
فرشتوں سے کچھ بھول چوک ہو گئی۔ یہ دھاندلی آسمانی طاقت نے جان بوجھ کر  
اصغری خانم کو ستانے کے لئے تو ہرگز نہ کی ہوگی۔

مگر الزام سارا اصغری خانم کے ماتھے تھوپ دیا گیا۔ لڑکا لڑکی صفا چھوٹ گئے  
اور وہ دھری گئیں۔ صدمہ میاں کو کسی نے کچھ نہ کہا کہ وہ بہن کی بانہہ پکڑ کر اسے  
عذاب دوزخ جھیلنے کو جھونک آئے سارا گھر منہ پیٹ کے رہ گیا۔ کسی کی ایک نہ  
چلی۔

ہائے اصغری خانم کہیں منہ دکھانے کی نہ رہیں۔ کیا آن بان شان تھی۔  
بیچاریوں کی۔ مجال تھی جو محلہ میں ان کے بغیر کوئی کاج ہو جائے۔ کسی کی بیٹیا کا کن  
چھیدن ہوتا تو انہیں کو دیوچ کر بیٹھنے کے لئے بلوایا جاتا۔ کسی کے بال بچہ ہوتا تو وہی



زچہ کا پیٹ تھام کر سارا دیتیں۔ پھر توفیق جہاں تو ان کی سگی میبری تھیں اور روشن کو شیشے میں اتارنا کوئی کھیل نہ تھا۔ اس لئے معاملہ انہی کو اپنے ہاتھوں میں لینا پڑا۔

صد میاں چھ سال انگلستان رہ کر لوٹے تو بیٹے کی سلامتی کی خوشی میں توفیق جہاں نے میلاد شریف کروایا تھا۔ بریلی والے میاں خاص طور پر میلاد پڑھنے تشریف لائے تھے۔ سب عورتیں اندر والے گول کمرے میں بیٹھی ثواب لوٹ رہی تھیں۔ لڑکیاں بالیاں چک سے لگی کھس پھس کر رہی تھیں کہ اتنے میں صد میاں روشن کے ساتھ داخل ہوئے وہ شاید شریف کے بارے میں بھول ہی چکے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید لوٹ جاتے مگر میاں صاحب نے گھور کر دیکھا تو پکڑے گئے۔ مجبوراً ”دونوں ایک طرف بیٹھ گئے۔“

”ہائے یہ کون ہے؟“ لڑکیوں نے روشن کو دیکھ کر کلیجے تھام لئے۔ صد میاں کے سارے دوستوں کو دیکھا تھا۔ کم بخت سب ہی تو چمرخ مرگھلے اور گھونچو تھے۔ مگر روشن اپنے نام کی طرح روشن تھے کہ آنکھیں چکا چوند ہو گئیں، کلیجے منہ کو آ گئے جیسے دیوار پھاڑ کر آفتاب سوانیزے پر آ گیا۔ کیا تیز تیز جگمگاتی آنکھیں جو ہنستے میں یوں کھو جاتیں کہ جی گم ہو جاتا۔ دانت گویا موتی چن دیئے ہوں۔ چوڑے چکے شانے لمبی لمبی تراشوں جیسی سڈول انگلیاں اور رنگت۔۔۔۔۔ جیسے انہوں نے بھی بوکھلا کر جلدی سے انگلیاں چوم لیں۔ ایسے بھونڈے پن سے کہ لڑکیوں کے دل اچھلنے لگے۔ بڑے میاں کا جی خوش ہو گیا۔ وہ انہیں بڑے فخر سے بھیگی بھیگی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔ سید کا بیٹا انگلستان کیا امریکہ بھی چلا جائے، رہے گا کھرا سید مگر لڑکیوں کو خوب معلوم تھا کہ ان لوگوں کو خاک کچھ یاد نہیں، یونہی ملاؤں کی طرح بدبد ہونٹ ہلا رہے تھے۔ ان کی اس شرارت پر اتنی بری طرح ہنسی کا حملہ ہوا کہ صفرا خانم نے دور سے پنکھے کی ڈنڈی دکھا کر دھمکایا تب کہیں جا کر ہنسی نے دم توڑا۔

میلاد شریف کے خاتمے پر جب سلام پڑھا گیا۔ تو سب کھڑے ہو گئے۔ بڑے میاں نے محبت سے لڑکوں کی طرف دیکھ کر سلام پڑھنے میں شریک ہونے کا







ڈیپھ ہو گئی ان کی۔“

”انا للہ وانا الیہ راجعون! کیا کرتا ہے لڑکا؟“ نانی بی نے پوچھا۔

”کون سا لڑکا؟“ صد نے جاتے جاتے پلٹ کر پوچھا۔

”اے یہی تیرا دوست۔“

”روشن؟“ ڈاکٹر ہے ایم۔ ڈی کی ڈگری لینے ساتھ ہی گیا تھا۔ پھر وہیں

انگلینڈ میں نوکری کر لی۔ کچھ کھانے کو بھجوا دیجئے۔ مگر میرے کمرے میں بھجوائیے

گا۔ باہر درجن بھر بڑھے بیٹھے ہیں۔ سب ہڑپ کر جائیں گے۔ یہ بڑھاپے میں لوگ

اتنے ندیدے کیوں ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔؟“

صفرا خانم فوراً ختم ٹھوک کر میدان میں پھاند پڑیں۔ تیر تلوار سنبھالے اور

ہلہ بول دیا۔

”اے صد میاں جیسے تم ویسے تمہارا دوست۔ اس سے کیا پردہ؟ ادھری گول

کمرے میں بلا لو۔“ وہ آنکھوں میں رس گھول کر بولیں۔ ان دنوں سیدوں میں بھی

کانا پردہ شروع ہو گیا ہے۔ خاندان کے بڑے بوڑھوں کی آنکھ بچا کر لڑکیاں کھلنے

نمائش میں جائیں۔ مشاعروں میں شریک ہوں، سہیلیوں کے بھائیوں سے اور

بھائیوں کے دوستوں سے بڑی بوڑھیوں کی رضا مندی لے کر ملیں مگر سڑک پر

جاتے وقت ٹانگہ پر پردہ باندھا جاتا ہے۔ بزرگوں کو دکھانے کے لئے۔ صد روشن کو

گول کمرے میں لے آئے۔ صبیحہ کے سوا سب وہیں چائے پینے لگے۔

صبیحہ کو صفرا خانم کمرے میں گھیرے چوٹھے حملے کر رہی تھیں۔ اس کا بس

چلتا تو جینز کا کوئی بھاری زرتار جوڑا پہنا دیتیں۔ مگر صبیحہ حسب عادت بڑی بڑی

آنکھوں میں آنسو لئے سو رہی تھیں۔ گھر میں جب کوئی موٹا مرغا آتا تو اسے یونہی

سجایا جاتا۔ بیچاری کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو جاتے، منہ لٹک جاتا اور ناک پر پسینہ

پھوٹ نکلتا اور شکل چوٹی بلی کی سی ہو جاتی۔ جب سے کئی پیغام آکر پھر گئے۔ تب

سے اسے اور بھی وحشت ہونے لگی تھی۔ روشن جیسا ہینڈ سم اور کماؤ بر بھلا کیسے

پھنسے گا۔ ذرا کوئی لڑکا کسی قابل ہوا تو خاندان والے ہی رشتہ کا حق وصول کرنے



دوڑ پڑتے ہیں۔ پھر ملنے ملانے والوں کی باری آتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی شادی بھی ہو چکی ہو۔ دو بچے ہوں!

مگر اصغری خانم کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ نہ انہوں نے دھوٹ میں چونڈا

سفید کیا تھا۔

”لوٹنا خیر سے کنوارا ہے، بیاہے مرد کا ڈھنگ اور ہی ہوتا ہے۔“ دوسرے

انہوں نے پہلے ہی صدمہ سے پوچھ لیا تھا۔

”بیوی بچے سنگ ہی ہیں؟“

”کس کے؟ روشن کے۔۔۔۔۔ ارے اس گدھے کے بیوی بچے کہا۔ ابھی

تو خود ہی بچہ ہے۔ مجھ سے دو سال چھوٹا ہے۔“

بس اصغری خانم نے چٹ حساب لگا لیا کہ صبیحہ سے چار سال بڑا ہوا۔ خوب

جوڑی رہے گی۔ اس سے کم فرق ہو تو چار بچوں بعد بیوی میاں کی اماں لگنے لگتی

ہے۔ ویسے مرنے والے تو اصغری خانم سے بیس برس بڑے تھے۔ ہائے کیا عشق تھا

اپنی دلہن جان سے!

مگر اصغری خانم جب سجا بننا کر صبیحہ کو گول کمرے میں لائیں تو روشن جا چکے

تھے؟ اصغری خانم کا بس چلتا تو چیختی چلاتی ان کے پیچھے لپکتیں۔ مگر صدمہ میاں کی انہوں

نے خوب ٹانگ لی۔

”جوان بھنیا کی پال کب تک ڈالو گے۔ کیا سفید چونڈے میں افشاں چنی

جائے گی۔ تم ہی کچھ نہ کرو گے تو کون کرے گا؟“

”کون ہیں؟“ صدمہ خیاہ مخواہ چڑ گئے۔ ”مجھ سے خود تو اپنی شادی ہو نہیں رہی

ہے دوسروں کی کیا کروں گا؟“

”مذاق میں ہر بات کو ٹال دیتے ہو۔ آج اس کا باپ زندہ ہوتا تو۔“ اصغری

خانم ٹسر ٹسر روئے لگتیں۔ ”آخر کیا ہو گا ان چار چٹانوں کا۔ توفیق گکوڑی کو ہول دل

کے دورے نہ پڑیں تو اور کیا ہو۔“

”کون سی چٹانیں؟ صدمہ میاں انجینئر تھے۔ انہیں چٹانوں، پہاڑیوں سے بڑی



دلچسپی تھی۔

”اے میاں بنو مت اللہ رکھنے اب تم اس قابل ہو اپنے دوستوں میں سے ڈھونڈو کوئی؟“

”بھئی میں ان جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔“ وہ ٹال کر چل دیئے۔  
 مکھن میں زعفران کے ساتھ چٹکی بھر شابی رنگ ملا دیا ہو۔ پنچوں نے دیکھا کہ صبیحہ کے سلونے چہرے پر یکایک ہلدی بکھر گئی۔ گھنی گھنی پلکیں لرزیں اور جھپک گئیں۔ ہونٹ میٹھے میٹھے ہو گئے۔ لڑکیوں کو مکاری سے مسکراتا دیکھ کر بگڑ بیٹھی۔  
 صمد میاں اور روشن ننگے سر بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر ایک ڈاڑھی والے بزرگ غرائے۔

”اے صاحب زادے اتنے بھی جنٹلمین نہ بنئے۔ میلاد شریف کے موقع پر ننگے سر بیٹھنے والوں کے سر پر شیطان دھولیں مارتا ہے۔“

”روشن نے سہم کر صمد کی طرف دیکھا انہوں نے جھٹ جیب سے رومال نکال کر چپاتی کی طرح سر پر منڈھ لیا۔ روشن نے بھی ان کی نقل کی۔ ہوا سے رومال اڑتا تو بندر کی طرح سر پر ہتھیلی جما کر بیٹھ گئے۔ ایسی بھولی بھالی شکل لگی کہ لڑکیوں کی پارٹی میں گدگدی رہ گئی۔ صبیحہ کے مکھڑے کی ہلدی میں ایک دم گلاب کھل گیا اور نارنجی رنگ پھوٹ نکلا۔

ڈاڑھی والے حضرت جو مونچھ ڈاڑھی صفا چٹ ولایت پلٹ لڑکوں کی گھات میں بیٹھے تھے اور اپنی قہر آلود نگاہیں دونوں پر گاڑ رکھی تھیں مگر یہ دونوں بھی چوکنے بیٹھے تھے اور بالکل بندروں کی طرح ان کی نقل میں آنکھیں بند کر کے جھوم جھوم کر سن رہے تھے اور سر دھن رہے تھے۔ بڑے میاں نے درود پڑھ کر انگلیوں کے پوروں کو چوما اور آنکھوں سے لگا لیا۔ جھٹ صمد میاں نے ان کی نقل کی اور روشن کو کہنی ماری۔

چل دیئے۔

مگر آندھی طوفان ٹلے اصغری خانم کو کون ٹالے؟ آتے جاتے ٹانگ لیتیں۔



پھر انہیں ایک انوکھی ترکیب سو جھی۔ وہ فوراً کسی جان لیوا اور انجانے مرض میں مبتلا ہو گئیں۔ اور عین اس وقت جب روشن صدم میاں سے ملنے آئے۔ ان پر سخت بھیانک قسم کا دورہ پڑ گیا۔ اتنے زور سے آہیں بھریں کہ بیچارے بدحواس ہو گئے۔ بڑی دیر تک دیکھتے بھالتے رہے۔ اصغری خانم آخری وقت میں بھلا صبیحہ کا ہاتھ کیوں کر چھوڑ دیتیں۔ وہ ان کے سرہانے سہمی ہوئی بیٹھی رہی کہ کہیں چور پکڑ نہ لیا جائے۔ انہیں خاموش دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ اصغری بوا کی ٹچال پکڑی گئی۔۔۔۔۔

”کیا بیماری ہے؟“ انہوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”یو پوچھتے کون سی بیماری نہیں ہے۔ گردوں کی حالت خراب ہے معدہ قطعی کام نہیں کرتا۔ دل بس ذرا سادھڑک رہا ہے۔ آنتوں میں زخم ہیں۔ بخیمروں کے نیچے پانی اتر آیا ہے۔ انہوں نے صدم کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ صبیحہ نے سنا تو ہنسی نہ روک سکی۔ اصلی مرض کی طرف تو انہوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

”ایمان مٹاؤ بھی اتنی بیماریاں ہوتیں تو زندہ کیسے رہ سکتی تھیں اور زندہ بھی کیسی سارے خاندان پر چابک پھنکارتی ہیں۔“ صدم بولے۔

”یہی تو میں سوچ رہا ہوں یہ زندہ کیسے ہیں۔ کچھ ایسی لیپا پوتی ہوتی رہتی ہے کہ کھنڈر کھڑا ہے۔ ڈاکٹری سے بڑھ کر کوئی طاقت کام کر رہی ہے۔“ اصغری بوا ٹھنکیں اور بدک انھیں۔

”اوئی نوج۔۔۔۔۔ دور پار۔۔۔۔۔ اے لو میرے دشمن کا ہے کولب گور ہوتے۔“

”اے میاں تم ڈاکٹر ہو کہ نرے سلوتری۔ اے چولے میں جائیں تمہاری دوائیں۔ موئی فرنگیوں کی دواؤں میں دنیا بھر کی قلتیں ہوتی ہیں تھو۔“ وہ بڑبڑائیں۔

”بس اللہ پاک عزت آبرو سے اٹھالے۔ اے لڑکے ٹھک سے بیٹھ۔ گلوڑیو کچھ شربت پانی لاؤ کہ گدھیوں کی طرح کھڑی منہ دیکھ رہی ہو۔ اے بچے کے بہنیں ہیں تیری۔“ اچانک صغرا خانم نے پنیر ابدلا۔

”ایں۔۔۔۔۔؟ جی ذو۔۔۔۔۔ دو بڑی بہنیں۔۔۔۔۔ ایک بیوہ ہے؟“



روشن نے سنبھل کر وار روکا۔

”چہ ہے ہے اور دوسری کہاں بیاہی ہیں۔“

”کانپور میں سول انجینئر ہیں ان کے۔“

”اے کانپور ہی میں تو اپنے تقی میاں کے خلیا ساس رہو ہیں۔ کیا نام ہے

اللہ رکھے بہنوئی کا۔“

”ایس این کچلو۔“ صد میاں بولے۔ ”کیوں کیا کچھ بنوانے کا ارادہ ہے۔“

”ہاں اپنی قبر بنواؤں گی۔ اچھا تو تم لوگ کشمیری ہو۔“ بے چاری کچھ بجھ

گئیں۔

”یہ سیف الدین کچلو کے خاندان سے کچھ ہے سیل۔“

”جی وہ میرے چچا کے دوست تھے۔“

روشن کے جانے کے بعد ٹپ کر مریضہ اٹھ بیٹھیں۔

”بھئی سوچ لو کشمیری ہیں۔“

”ہاں اور اس سے پہلے جو پیغام آیا تھا وہ لوگ کبوہ تھے۔ بس یہی دیکھتی

رہو۔ ارے سب انسان برابر ہیں۔ پاک پروردگار نے سب کو اپنے ہاتھ سے بنایا

ہے۔ مسلمانوں میں ذات پات چھوت چھات نہیں ہوتی۔“ توفیق جہاں بگڑنے

لگیں۔

”بھئی مجھے یہ صبیحہ کے نخرے پھوٹی آنکھ نہیں بھاتے۔“

وہ آیا اور ادھر بنو نہ تھو تھا کر بھاگیں۔ جی چاہا لگاؤں چڑیل کے دو چائے۔“

مگر صبیحہ کیا کرتی۔ روشن کے آتے ہی وہ کمرے میں بھاگ جاتی۔ یوں سب

کے سامنے گھور کر دیکھتی تو نہ جانے وہ کیا سوچتے دروازے کی آڑ سے مزے سے

جی بھر کے دیکھ سکتی تھی۔ اب تو علاج کے لئے وہ بلا ناغہ آنے لگے۔

اصغری خانم کچھ ایسی ترکیب چلتیں کہ صبیحہ کو پاس روک لیتیں اور بیچارے

روشن تو ایسے جھینپو تھے کہ صبیحہ بھی شیر ہو گئی۔ انہیں ایک نظر بھر کے اپنی بھوری

آنکھوں سے دیکھتی تو ان کے ہاتھ میں انجکشن کی سوئی کانپنے لگتی۔ وہ ہنس پڑتی تو







ہے وہ بھی تو صاحب بہادر بن گئے ہیں۔“

”خالہ جی آپ روشن سے فاتحہ پڑھوا رہی ہیں؟ صمد نے قہقہہ لگایا۔

”اے عارت ہو کل مونہو۔ لعنت ہو“ موئے آج کل کے لونڈے ہیں کہ

نگوڑے سب کے سب بے دین۔“ صفرا خانم بالو شاہیوں کا تھال اٹھا کر دالان میں لے گئیں۔ مگر سچاری کی فکر دور نہ ہوئی۔

”اے توفیق جہاں۔“

”ہاں کیا ہے؟“ توفیق جہاں نے پنکھے سے مکھی کو دھمکا کر جواب دیا۔

”اے میں کہوں یہ آج کل کے لڑکوں کے نکاح کیسے پڑھے جاویں گے۔“

”کیوں۔“

”اے انہیں۔۔۔۔۔ آمنتو بھی تو نہیں آتی، آمنت باللہ۔ ایک آیت ہوتی

ہے جو نکاح کے وقت دولہا کو پڑھنی پڑتی ہے۔ جس میں وہ اقرار کرتا ہے کہ میں خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کی بھیجی ہوئی کتابوں پر ایمان رکھتا ہوں۔ اس آیت کو پڑھے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا۔

”قاضی جی بولتے جاتے ہیں اور دولہا دہراتا جاتا ہے۔ بس بس اب تو ایسے

یہ نکاح ہو رہے ہیں۔“ توفیق جہاں بولیں۔

”مگر اب اس نیاز کا کیا ہو؟“ وہ فکر مند ہو گئی۔

”کیسی نیاز؟“

”ارے بھئی میں نے تو جھوٹ موٹ کہہ دیا تھا کہ ان کی بری ہے۔ یہ منت

کی نیاز ہے۔ لڑکا خود نیاز دے جب ہی پوری ہوگی۔“

”ارے چلو ادھر۔ ایسی کوئی منت نہیں ہوتی۔“ توفیق جہاں نے ٹالنا چاہا۔

”تمہیں جی تم تو کسی بات کو مانتی ہی نہیں ہو۔ خیر پھر سہی۔“ اور وہ خود

دوپٹے سر پر منڈھ کر بدھ بدھ نیاز دینے لگی۔

دوسرے دن روشن آئے تو جھٹ پوچھا۔ ”کیوں رے تو نے قرآن ختم کیا

تھا؟“



”جی؟۔۔۔۔۔ نہیں تو ایک بار انگریزی میں پڑھا تھا تھوڑا سا۔۔۔۔۔ تو۔“  
روشن ہکلائے۔

”ہے ہے یہ مولیٰ لکڑ توڑ زبان میں کیسا قرآن؟ لڑکے دیوانہ تو نہیں ہوا۔“  
”تو صمد بھیا نے کون سا پڑھ لیا ہے۔ ساری عمر انگریزی اسکولوں میں رہے۔  
کالج میں فرصت نہ ملی۔ اس کے بعد انگلینڈ چلے گئے۔“ مگر خود ہر رمضان کے مہینے  
میں پانچ قرآن ختم کرتی ہے۔ روزے نماز کی پابند تھی۔ حالانکہ صمد کہتے تھے۔ وہ  
نازک بدن بننے کے لئے فاتے کرتی تھی۔۔۔۔۔ توبہ توبہ!

سوت نہ کیاس کوئی سے لٹھم لٹھا! روشن کی آنکھوں سے دل کے راز کا پتہ  
بچے بچے کو چل چکا تھا۔ مگر زبان نہ جانے کیوں گنگ تھی۔ کبھی بیٹھے بیٹھے ایک دم  
آنکھوں میں غم کا اتھاہ سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا اور سر جھکا کر اٹھ کر چلے جاتے۔  
صبح کی طرف ایسی تری ہوئی نگاہوں سے دیکھتے جیسے وہ کسی دوسری دنیا میں کھڑی  
ہو، درمیان میں فولادی سلاخیں ہوں اور کالے دیو کا پہرا۔ صبح کے مکھڑے پر غروب  
اور اطمینان کا نور پھوٹنے لگا تھا۔ جیسے منزل پر پہنچ کر آرام سے چھاؤں میں بیٹھ گئی  
ہو۔ ساری انجانی کسک اور تیابی مٹ کر گھروند! جگر مگر کرنے لگا ہو۔

مگر دقت یہ تھی کہ لڑکے کا سہا کوئی ہے نہیں پھر پیغام کیسے منگوا یا جائے۔  
آج تو شادیاں ایسے ہی ہوتی ہیں کہ دو جنوں کا ایک دوسرے پر جی آ گیا۔ دوستوں  
نے پیغام دیا، یاروں نے شادی کر دی۔ اصغری خانم کو ایسی ٹکڑہ توڑ شادیوں سے بھی  
اتھوں نے رو پیٹ کر سمجھوتہ کر لیا تھا۔ پہلے پہل جب نصرت اور حلیقہ نے ایسی  
چٹ پٹ شادی کی تھی تو انہوں نے بڑا شور مچایا تھا۔ مگر پھر انہیں اپنی پالیسی نرم  
کرنا پڑی۔

ادھر روشن بھونڈو تھے ادھر صبیحہ بھی ذرا چنٹ ہو تیں۔ تو کبھی کا انہیں ڈکار  
چکی ہوتیں۔ کاش اسے کوئی چھوٹی مولیٰ پیاری سی بیماری لگ جاتی تو روشن اس کا  
علاج کرتے کرتے خود مرض مول لے بیٹھتے مگر اصغری خانم گھیر گھیر کر مرغی کو ڈربے  
میں پھانسنے کی کوشش کرتیں مگر اپنے منہ کی کھا کر رہ جاتیں۔



”اے لڑکی تیرے سر میں آدھے سر کا درد ہو رہے تھے۔ علاج کیوں نہیں کرا لیتی ڈاکٹر سے؟“ وہ صبیحہ کو رائے دیتیں۔

”اے واہ خالہ جی میرے سر میں کالے کو ہوتا درد۔“ وہ بگڑے لگتی گدھی۔  
 ”پہلے تو ہووے تھا۔ اب بھلی چنگی ہو گئی ہو تو مجھے نہیں خبر۔“ وہ صبیحہ کی صحت سے جل کر کہتی۔ ”دیکھ تو بیٹا روشن کیسی جھلس کر رہ گئی ہے بچی۔“  
 ”ارے خالہ جی ان کی تو رنگت ہی سیاہ بھٹ ہے۔ کہئے تو کھال کھینچ کر دوسری چڑھا دوں پلاسٹک سرجری سے۔“

”جی ہاں بڑے آئے کھال کھینچنے والے۔ ہم کالے ہی بھلے۔“  
 ”اوئی کالی کدھر ہے لونڈیا۔ ہاں گیہوں رنگت ہے۔“ اصغری بوا پریشان ہو کر کہتیں۔

”جی ہاں ادھر کچھ دنوں سے امریکہ سے گیہوں کلا بھی کالا ہی آ رہا ہے۔“  
 روشن چھیڑتے۔

”ہاں بس ایک آپ ہی زمانے بھر میں گورے ہیں، ہونہ پھیکے شامجی!“  
 صبیحہ چڑ جاتی۔

”آپ تو نمک کی کان ہیں۔ چلے کچھ تو مزہ آ جائے گا۔“ وہ چپکے سے کہتے۔  
 صفرا خانم بد مزگی مٹانے کو جلدی سے بات بدلتیں۔ ”اے کالی گوری رنگتیں سب اللہ کی دین ہیں پرسوں کہہ رہی تھی سر بھاری ہے ویسے تیرے بال بھی تو جھڑ رہے ہیں۔ بیٹیا کوئی بال بڑھالے کی دوا بتاؤ۔“  
 ”ارے خالہ جی بہت بال ہیں۔ ہاں کہئے تو دماغ کو بڑھانے کے دو چار انجکشن لگا دوں۔“

”آہا ہا بڑے آئے سلوتری جی۔“ اور روشن کا چہرہ ہنستے ہستے صبیحہ کے گلابی آنچل کو مات کرنے لگتا۔

صفرا خانم اس کچر پچر سے اداس ہو کر بڑی زور زور سے کراہنے لگتیں۔ ایک دن انہوں نے صمد کو گھیر کر بات کر ہی ڈالی۔



”اے بھیا کوئی پیغام نہ ایغام۔“ ”کیسا پیغام؟“

”اے روشن کا۔۔۔۔۔ اس سے کہو اپنی بہن بہنوئی سے پیغام بھجوائے۔“

”مگر خالہ جی روشن۔“

”ہاں ہاں بیٹے مجھے سب معلوم ہے۔ مگر اب زمانہ بدل گیا ہے۔ ہزاروں شادیاں ہو رہی ہیں۔ کب تک لڑکی بٹھائے رکھیں گے۔ توفیق جہاں کا دل کوئی دن اور کرام دے گا۔ ہر دونوں میں اللہ رکھے چاؤ بھی ہے۔“

”مگر۔۔۔۔۔ خالہ جی۔“

”بیٹے تم اللہ رکھے سات سمندر پار ہے تمہیں کیا معلوم دنیا کتنی بدل گئی۔ سیدوں کی بیٹیاں کن کن کو گئیں۔ سرفراز میاں کی لڑکی نے تو زہر کھالیا۔۔۔۔۔ اب اللہ کی مرضی یہی ہے تو جہالت کی باتوں میں پڑنے سے کیا حاصل۔“

”مگر۔۔۔۔۔ میں سوچوں گا۔“ ”صدم میاں چکرائے سے جا کر باہر پڑ گئے اس انقلاب کی انہیں امید نہ تھی۔ دنیا سے دور وہ کتنے جاہل رہ گئے جبہ ان کے بزرگ تک اتنے روشن خیال ہو چکے تھے۔ ان کا دل غرور سے بھر گیا۔ شام کی گاڑی سے انہیں سائنس کالج ٹرنس میں شرکت کے لئے جانا تھا۔ اب وہاں سے لوٹ کر ہی سب کچھ ہو گا۔ ادھر اصغری خانم نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ یہاں بیٹی بیاہنی تھی۔ اس لئے توفیق جہاں کو کہہ سن کر پٹا لیا کہ صبیحہ بیکار وقت برباد کرنے کے اگر کچھ کام سیکھنے لگے تو کیسا رہے؟ طے ہوا کہ روشن میاں کی ڈپنری میں نرسنگ سیکھنے چلی جایا کریں۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اور صبیحہ نرسنگ سیکھنے جانے لگی۔ جس کا سبق صبح سے لے کر رات کے سینما کے آخری شو تک چلتا رہتا اور صبیحہ چست چالاک نرس کے بجائے دن بدن اس جانے پہچانے مرض میں کھو گئی جو جنم جنم سے مرد عورت کو سونپتا آیا۔ روشن کے سویٹر بنے جانے لگے اور کمرے میں ان کی فیض، ان کے موزے بکھر سے گئے۔ بس چودہ طبق روشن ہو گئے۔“

جیسے یہ شکار گرتا ہے شکاری جو مکر گانٹھے جھاڑیوں میں دھکا ہوتا ہے ایک ہی جست لگا کر آدو چتا ہے اور گلے پر چھری رکھ دیتا ہے۔ اصغری خانم نے بھی سادی



بیماری دور پھینکی اور دھم سے اکھاڑے میں آن جمیں۔ جھپا جھپ جینز سلنے لگا۔  
دیفوں پر سے لحاف تو شک کے انبار اتار کر قلعی ہونے لگی۔ ڈیوڑھی پر سار بیٹھ گیا  
 کہ سامنے نہ بنواؤ تو موا اپنے تھوپ دے گا۔ بی سیدانی محلے کی پوٹ سنبھال کر طوی  
 چمپا او گوکھرد توڑنے لگیں۔ گھوکھرو کے ہر کنگورے پر لب بھر کے دعائیں دیتی  
 جاتیں۔ گویاں سہاگ اور مزے یاد کر کے کاپیوں میں اتارنے لگیں کور سے دولہا  
 اور سالونی دلہن پر گیت جوڑے چلنے لگے۔

”اے بھئی باپ کا نام روشن تو بیٹے کا۔“ صغرا خانم فکر مند ہو کر پوچھتیں۔  
 ”جوشن۔“ کوئی شوخ سیلی چھیڑتی تو صبیحہ جل کر اس کی بوٹیاں نوچنے لگتی۔  
 ”اے بھئی انہیں اپنی کلورانی ہی پسند ہے تو تم لوگ کاہے کو جلی مرتی ہو۔“  
 صغرا خانم ڈانٹتیں اور صبیحہ آنکھوں میں خوابوں کے جھمکے لئے زرسنگ  
 سیکھنے بھاگ جاتیں۔

مگر کے خبر تھی یہ گل کھلائے گی۔ پل بھر میں چمکتا سورج الٹا تو ابن جائے گا۔ وہی روشن جو کل تک چودھویں کے چاند کو شرما رہے تھے۔ لوٹ پوٹ کر کھڑے ہوئے تو کالا دیو! اور اس کالے دیو نے پلک جھپکاتے میں اونچے اونچے محلوں کو چمکنا چور کر دیا۔ صفرا خانم کے سارے نئے پرانے مرض ایک دم ان پر ٹوٹ پڑے۔ جب صمد میاں کانفرنس سے جم جم کر لوٹے تو گھر میں جیسے کوئی میت ہو گئی ہو۔ سناٹا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ صفرا خانم کا ایک کوکوسا زمین تو ایک آسمان پر۔ زمر کا محل ساتویں آسمان پر لرزا اور ایک دم پھس سے بیٹھ گیا۔ قلعی کی دیوڑھیوں پر پھر لحاف تو شک لد گئے۔ دھنک کی پنڈیاں الجھ کر جھونج بن گئیں۔ سارے دیوڑھی سے دھتکار دیا گیا اور جس نے سینا منہ پٹیٹ لیا۔

”آخر ہوا کیا۔۔۔۔۔ کچھ معلوم تو ہو۔“ صد میاں نے پوچھا۔

”ارے اس بھیتی سے پوچھو۔ جو چڑھ چڑھ کے دیدے لڑانے جاتی تھی۔“  
توفیق جہاں نے زانو پیٹ لیا۔ ”حرافہ۔“





## کار ساز

دوپہر تندور کی طرح تپ رہی تھی۔ ہوا دم گھوٹے نہ جانے کس غار میں دہکی منہ لگی بیٹھی تھی۔ ننگے پیڑ سوکھے ہاتھ پھیلائے بھٹک منگوں کی طرح چپ چاپ کھڑے تھے۔ ایک سوکھا مارا کتا دیوار کے سائے میں بیٹھا اپنے زخم چاٹ رہا تھا۔

”قامت کے دن سورج سوانیزے پر اتر آئے گا اور زمین سینہ پھاڑ کر پکھلتی ہوئی آگ اگلنے لگے گی۔ تب گناہگار مومنہ کے بل گر پڑیں گے۔“

مگر مولوی رفاقت علی کیوں مسجد کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اوندھے مومنہ گر پڑے؟ وہ تو بڑے متقی اور پرہیزگار تھے انہیں تو کبھی کوئی گناہ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ چھابوں میں برستا ہو کہ آندھی اپنا تباہ کھا رہی ہو، ان کی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی۔

دم بھر میں لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح بلوں میں سے نکل کر جمع ہو گئے۔۔۔۔۔ مولوی صاحب ذبح کی ہوئی مرغی کی طرح تڑپ رہے تھے۔ پھیند پرٹالوں کی طرح بہہ رہا تھا۔ لوگ نئی نئی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ کوئی کہتا درد قلوب ہے کسی کی رائے تھی کہ دل کا دورہ پڑا ہے یا شاید یوں یہ پھیل گئے۔ دھان پلن سے تو تھے بے چارے۔

اور اسی وقت فرشتہ رحمت کی طرح بچن بابو آ گئے فوراً موٹر رکی اور ”ہٹو ہٹو“ کہتے اتر پڑے۔ بچپن بابو میونسپلٹی کے الیکشن میں کھڑے ہوئے تھے۔ محلے محلے خاک چھانٹتے پھرتے تھے۔ مولوی صاحب کے محلے میں تو لوگ انہیں دیکھتے ہی نہایت ضروری کاموں میں مشغول ہو جاتے، دکانوں میں تالے بڑ جاتے اور مسجد میں



جماؤ ہونے لگتے، ٹھیٹ مسلمانوں کا محلہ تھا۔ جتنی جتنی ملک میں روشن خیالی بڑھتی جا رہی تھی، لوگ شدت سے فرقہ پرست ہوتے جا رہے تھے۔ لوگوں کو منانے میں بڑے ہل بیل لگانے پڑتے ہیں۔

بچن بابو نے موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا۔ انہوں نے مولوی صاحب کو اٹھا کر گھر پہنچایا۔ پوسٹ آفس سے فون کر کے ڈاکٹر کو بلوایا۔ بیگم آڑ میں کھڑی میلے آنچل سے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ بچے ایک دوسرے کا مونہہ تک رہے تھے۔ مولوی رفاقت بڑے مرنجاں مرنج انسان تھے۔ لالہ جی کی ٹال پر باون روپے مہینے پر حساب کتاب لکھ دیتے تھے۔ بچوں کو قرآن پڑھا دیتے تھے۔ چھ بچوں اور بیوی سے لدی پھندی گاڑی نہ جانے کن طلسمی گھوڑوں کے ہل پر گھسیٹ رہے تھے۔

ڈاکٹر نے آکر اس امر کی تصدیق کر دی کہ مولوی صاحب کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ حالت نازک ہے۔ ہلانے جانے سے دم توڑ دیں گے۔ مگر بچن بابو نے لگا میں سنبھال لیں اور فوراً ایک ہسپتال کا بیڈ منگوایا۔ ہینڈل چلانے سے اوپر نیچے اٹھتا تھا ایک آکسیجن سلنڈر بھی احتیاطاً ”منگوایا“ جسے دیکھ کر بیگم حواس باختہ ہو گئیں۔ بولیں ”ہے ہے یہ مواہم کا ہے کو آیا ہے؟“

سارا محلہ ٹوٹ پڑا، جیسے کوئی سرکس کا تماشا دیکھ رہا ہو۔ نلی کئی کی سفید ساڑھی پہنے نرس نے آکر تو ٹھاٹ جھادیئے نہ جانے کہاں سے ایک فوٹو گرافر ٹپک پڑا، اور کھٹا کھٹ تصویریں اتارنے لگا۔ دوسرے دن اخباروں میں تصویریں نکل گئیں۔ جن میں بچن بابو ہیرو کا رول ادا کر رہے ہیں۔ ضرورت تو نہیں تھی۔ لیکن ایک ایسی بھی تصویر لے لی گئی جس میں ڈاکٹر مولوی صاحب کو آکسیجن دے رہے تھے اور بچن بابو نکلی سنبھالے ہوئے تھے۔

شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بچن بابو زبردست اکثریت سے چناؤ جیت گئے محلے کا ایک ووٹ بھی ادھر سے ادھر نہیں ہوا۔

مولوی صاحب اچھے ہو گئے مگر بچن بابو کی مہربانیوں میں فرق نہ آیا۔ اخباروں میں مولوی صاحب پر مضمون نکلنے لگے۔ ان کے انٹرویو چھپے ”عربی اور



فارسی کا عالم فاقوں مر رہا ہے کیسی ناقدری ہے۔“ ویسے مولوی صاحب میٹرک فیل بھی تھے۔ بچن بابو نے ان کی بیماری کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک فنڈ کھول دیا۔ اپنی جیب سے پانچ ہزار دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو فنڈ سے دس ہزار کا عطیہ بھی دیا اور ان کے سیکرٹری کا خط بھی آیا۔ بڑے بڑے دھن والوں نے دل کھول کر دیا۔ چالیس ہزار کا پرس گورنر صاحب کے ہاتھوں مولوی رفاقت کو ایک شاندار جلسے میں پیش کیا گیا۔

بچن بابو نے فنڈ جمع کرنے کے لئے بڑے جوش و خروش سے جلسے کئے۔ ولپ کمار کو صدارت کرنے کے لئے آمادہ کر لیا اور ٹکیلا بانو بھوپالی کی قوالی کرائی۔ ہر جلسہ بہت کامیاب رہا۔ بچن بابو کا ایک فلیٹ خالی پڑا تھا۔ اس میں انہوں نے یوں یہ آفس بنا رکھا تھا۔ مولوی صاحب اس میں اٹھ آئے۔ چند برس میں ان کی کاپیٹ ہو گئی۔ بچے انگریزی اسکولوں میں داخل ہو گئے بیگم نے تنگ پاجامہ چھوڑ کر ساڑھی پہننا شروع کر دی اور انہیں پردہ بھی چھوڑنا پڑا۔ کیوں کہ اب چھوٹے موٹے جلسے ان کی صدارت میں ہونے لگے تھے اور سوشل ورک وغیرہ کے سلسلے میں بہت گھومنا پڑتا تھا۔

مولوی صاحب کی تقریریں بڑی پابندی سے چھپتیں اور ریڈیو سے نشر کی جاتیں جن کا لب لباب یہ ہوتا کہ ہم ایک ہیں اور ایک رہیں گے۔ کوئی اونچ نیچ کا سوال نہیں سب کی برابر کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ اقلیتوں کے نمائندے بھی آواز رکھتے ہیں۔

بچن بابو نے باقاعدہ ایک ”رفاقت فنڈ“ کا دفتر کھول رکھا تھا۔ ایک رسالہ بھی مولوی صاحب کی سرپرستی میں نکلنے لگا تھا جس کا ایک واحد مقصد ”اردو بچاؤ“ تھا یہ رسالہ اردو کی بقا کے لئے بڑے زور شور کی جدوجہد کر رہا تھا۔ بچن بابو ”اردو بچاؤ سوسائٹی“ کے روح رواں تھے۔

رفاقت فنڈ سے اردو ادیبوں کو انعامات دیئے جاتے تھے۔ لوگ تو الزام تراشی میں مزہ لیتے ہیں، بکو اس کرتے تھے کہ سارے انعامات بچن بابو کے چمچوں کو ہی عطا



کئے جاتے ہیں۔ ان جلسوں میں بڑے بڑے فلمی ستارے موجود ہوتے تھے۔ فلمی پریاں بروشنز بھیجتی تھیں اور جھولی پھیلا کر چندے جمع کرتی تھیں۔

مولوی رفاقت کی صحت بن گئی تھی۔ جسم بھاری ہو گیا تھا۔ تھوڑی سی توند بھی نکل آئی تھی، جو ان کی پوزیشن پر بہت بچتی تھی، ہاں بیگم کچھ زیادہ ہی بھر گئی تھیں ورزش کے لئے انہیں کلینک جانا پڑتا تھا۔

مسجد جانا تو بیماری کی وجہ سے چھوٹ ہی گیا تھا، مگر کبھی کبھی جمعہ کی نماز پڑھنے اور عید، بقرے عید پر پابندی سے مولوی صاحب ضرور تشریف لے جاتے تھے۔ کبھی محلے میں چلے جاتے تو باقاعدہ جلوس نکل جاتا۔ وہاں کے رہنے والے فخر کرتے تھے کہ مولوی صاحب کبھی ان کے محلے میں رہا کرتے تھے۔ مگر حیرت کی بات تھی کہ اتنا مرتبہ پا کر بھی غریبوں سے اتنے خلوص سے ملتے تھے۔

اس عرصہ میں مسز اندرا گاندھی تخت پر بیٹھ چکی تھی اور دن بدن ان کی ساکھ بڑھتی جا رہی تھی۔ مولوی صاحب ان سے کئی بار اقلیتوں کے نمائندے کی حیثیت سے ”اردو بچاؤ“ کے سلسلہ میں بڑی امید افزا ملاقاتیں کر چکے تھے۔ ان کے ساتھ کھینچی ہوئی تصویریں بڑے نمایاں ڈھنگ سے ان کے فلیٹ کے کونے کونے میں بچی ہوئی تھیں ان کے اخبار میں میڈم کی سیاسی نکتہ دانیوں، ان کی موروثی ذہانت اور دور اندیشی پر مدلل تبصرے چھپتے رہتے تھے۔ بھارت کا کلیان کرنے کے لئے قدرت نے ایک ناری کے روپ میں درگا کو بھیجا۔ انہوں نے ایک طویل نظم ان کی کارگزاریوں پر لکھی تھی جو کئی زبانوں میں ترجمہ کر کے دیس کے کونے کونے تک پہنچائی گئی جب وہ نظم مسز اندرا گاندھی کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے دہلی گئے۔ تو ٹیلی ویژن اور آکاش وانی نے بڑی خوبصورتی سے اس تاریخی واقعہ کو عوام کے مفاد کے لیے پیش کیا۔ بیگم بھی اس موقع پر موجود تھیں اور پورے وقت کیمرے کے لینس کو گھورتی رہیں۔

بیگم پر تو اس ملاقات کا نشہ چڑھ گیا ان کے ساتھ کھینچی ہوئی پروسان منتری کی تصویر سنہری فریم میں جڑ کر ڈرائنگ روم میں ایسی جگہ ٹانگ دی کہ ہر آنے



جانے والی کی نظر سب سے پہلے اسی پر پڑے۔ پھر وہ بڑی تفصیل سے ہر مہمان کو اس سہانی ملاقات کا ذکر سناتیں، ایسا شاندار نقشہ کھینچتیں کہ سننے والا بھونچکا رہ جاتا کچھ بد مزاج لوگ اس عظیم واقعہ کی روداد سن سن کر بور ہو چکے تھے اور بیگم کے پاس جاتے ہوئے کانپتے تھے مگر جب وہ اپنی نیم بار آنکھوں میں نقدیں بھر کر کہتیں۔ ”ہماری وزیراعظم ایک عورت نہیں، ایک معجزہ ہیں۔“ تو سب جھوم اٹھتے۔ مولوی صاحب کی تو بات ہی اور تھی، خود بیگم کی اتنی دور دور پہنچ ہو گئی تھی کہ سفارش مانگنے والوں کے ٹھٹ لگے رہتے تھے، سنا تھا وہ بڑے بڑے ایوارڈ اور پدم شری وغیرہ تک دلوانے لگی تھی۔

اسی وقت مولوی رفاقت صاحب کو دل کا دورہ پڑا۔ کچھ کوڑھ مغز لوگوں کا خیال تھا کہ دل کا دورہ مولوی رفاقت صاحب پر بچن بابو نے مصلحتاً پڑوایا تھا۔ چندہ جمع کرنے کے لئے نئے مواقع پیدا کرنے کے لئے ایک عدد دورے کی اشد ضرورت لاحق ہو گئی تھی۔ کیسے کم ذوق ہوتے ہیں لوگ کسی کی بہتری ہوتے دیکھ کر جل کر موعدا ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی سرمایہ دار کا کاروبار ترقی کرتا ہے تو کیا ملک کی ترقی نہیں ہوئی؟ بمبئی کی شان بڑھی کہ نہیں؟ اس میں ان عمارتوں کا کیا قصور لاکھوں انسان فٹ پاتھ پر یا جھونپڑے ہی میں رہتے ہیں اور بھی یہ بھی قسمت کی بات ہے کہ ملک کا زیادہ تر منافع ٹھیوٹل تک رہ جاتا ہے۔

خدا جسے چاہے دولت دے جسے چاہے عزت دے، ایک چٹا ہوا طبقہ اللہ کو پیارا ہے تو اس میں جل مرنے کی کون سی بات ہے؟

بچن بابو نے مولوی رفاقت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ کیا یہ مسلم طبقہ کی خوش حالی کا ثبوت نہیں؟ اگر اسی طرح لوگ ہر بچنوں اور آدی باسیوں کی دیکھ رکھ کریں تو ملک کا سب سے اہم سوال چٹکی بجانے میں حل ہو سکتا ہے۔ مگر بچن بابو جیسے دلش سینوک ہوں تب نا۔ آج مولوی صاحب کے دن پھرے، کل پورے طبقے کے دل در دور ہو جائیں گے۔

اس دورے میں مولوی صاحب شہر کے بہترین زسنگ ہوم میں رہے



اخباروں میں ان کی بیماری کی خبر پڑھ کر لوگ ٹوٹ پڑے بڑے بڑے عمدہ دار فستر تک عیادت کو آئے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ گورنر صاحب بھی لیڈی گورنر کے ہمراہ تشریف لائے۔ جلنے والوں نے کہا صرف گورنر صاحب ہی تشریف لائے لیڈی صاحبہ نہ آ سکیں۔ کچھ سرپھروں نے کہا۔ نہ گورنر صاحب تشریف لائے نہ لیڈی گورنر۔ سب پروپیگنڈہ ہے بے پر کی اڑائی گئی ہے۔

بڑے زور شور سے جلسے ہوئے چندہ جمع ہوا۔ فلمی شو ہوئے دو دو سو کے ٹکٹ بکے۔ سودنیر میں اشتہار الگ جمع ہوئے۔ فلمی ستاروں نے خوب ہلکا کیا۔ پتہ چلا۔ اس سودے میں گھانا رہا کیونکہ بڑے ستارے حسب عادت غوطہ دے گئے اور چھوٹے فنکاروں پر پبلک نے چھیل برسائیں۔ ایک گننام سی فلمی پری نے ایسا طوفانی رقص پیش کیا کہ مولوی صاحب اگر اپنے پرانے محلے میں ہوتے تو ضرور کہتے: لاحول ولا قوۃ! مگر انہوں نے آنسو بھری آواز میں سب کا شکریہ ادا کیا، پبلک کے غل غپاڑے میں کوئی نہ سن سکا۔ وزیراعظم نے اپنے فنڈ سے بیس ہزار دیئے اور عیادت نامہ بھی ارسال کیا۔ جسے بیگم رفاقت صاحب آنے جانے کو کسی بہانے سے دکھا دیتیں۔

پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ فرقہ پرستی ہمارے خون میں رچ بس چکی ہے۔ لوگوں کو بچن بابو اور مولوی رفاقت کا بھائی چارہ پھوٹی آنکھ نہ بھایا۔ انہوں نے ان کے کان بھرنے شروع کئے۔ سب سے زیادہ انہوں نے بیگم کو بھڑکایا۔ وہ غریب فوراً بھڑک گئیں۔ عودت ذات کانوں کی کچی ہوتی ہے انہوں نے کہا کہ ”رفاقت فنڈ“ میں مال گول ہو رہا ہے۔ بچن بابو مختلف ناموں کے کاروبار چلا رہے ہیں۔ چھوٹی موٹی فیکٹریاں کھول رہے ہیں۔ فلیٹ خرید رہے ہیں۔ مولوی صاحب کے نام پر لوٹ بچا رکھی ہے کئی سینما ہال خریدے ہیں۔ جن میں مولوی صاحب کا کہیں ذکر نہیں۔ وہ تو زیرے الو ہیں، جنہیں تو کچھ خبر ہی نہیں۔ مولوی صاحب نے بیگم کے تقاضوں سے متنگ آکر بچن بابو سے حساب پوچھ لیا۔ کچھ دن تک تو وہ آئیں بائیں شائیں کر کے ٹالتے رہے پھر ایک دم برا مان گئے بڑی ٹوٹو میں میں ہوئی۔ بچن بابو بری طرح روٹھ



گئے۔ مولوی صاحب کے چھکے چھوٹ گئے۔

”رفاقت فند“ گھائے میں جانے لگا۔ سارا غصہ بیگم پر اترا۔

”اری نیک بخت، خواہ مخواہ اڑھن ڈالو دی۔“ انہوں نے بیگم کی ٹانگ لی۔

”بچن بابو خفا ہو گیا۔ اب کیا ہو گا؟“

”ہو جانے دو خفا۔ کیا مرغ نہ ہو گا تو صبح نہ ہو گی۔“ وہ بولیں۔ ”افتخار بھائی

کہتے ہیں۔ گاڑی چل نکلی ہے اب روکے نہ رکے گی۔ جیسے اللہ نے ہمارے دن پھیرے دیے سب کے پھیرے اور پھر افتخار بھائی اپنے ہیں۔“

”ارے چل موئے! کون سا فراڈ؟ بڑا فراڈ کا بچہ! بیگم بولیں۔ مگر مولوی

صاحب نے دونوں کو ٹھنڈا کیا۔ اگر گندگی اچھلنے لگی تو پیرا ہو جائے گا بھڑکے چھتے کو چھیڑنا ٹھیک نہیں۔“

بڑی بیٹی کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی تھی۔ بیگم کے دل میں ہول اٹھ رہے

تھے۔ دولہا کو ستر ہزار گھوڑے جوڑے کی دینا طے پایا تھا۔ راتوں کی نیند حرام ہو گئی

تھی۔ بس بچی کی شادی پر انہوں نے جا کر بچن بابو کے پاؤں پکڑ لئے۔ جو ناچاتی ادھر

ادھر کے لوگوں نے کرا دی تھی۔ وہ خلیج بنتی جا رہی تھی۔ بیگم نے الٹی میٹم دے دیا

کہ اگر بچن بھیا شادی میں نہیں بیٹھے تو برات اٹھوا دیں گے اور بچی کو زہر دے

دیں گے۔ آخر نور جہاں ان کی منہ بولی بیٹی تھی۔ بچن بابو رو پڑے۔

ایسا جی کھول کر انتظام کیا کہ لوگ عیش عیش کرنے لگے۔ کیا ہنگامہ رہا ہفتہ

بھر چار دن تک بدیسی شراب پانی کی طرح لندھائی گئی۔ باوجود اس قحط ماری کے

سینکڑوں آدمی صبح شام ترمال اڑاتے رہے۔ عین شادی کے دن کو معاملہ بالکل

شیشا ہی رہا۔ اپنی پوزیشن کا کچھ تو فائدہ یار دوستوں کو بھی ملنا چاہئے۔ دیا رام جی جو

سیل ٹیکس کے افسر تھے۔ انہوں نے کیڑنگ کا انتظام اپنے ذمے لے لیا۔ شہر کے

چند بڑے بڑے ہوٹلوں سے دنیا بھر کی نعمتیں حاضر ہو گئیں۔ امتلا لڈیہ اور بافراط کھانا

تو دوسری جنگ عظیم سے پہلے بھی شاید ہی کسی ایک دسترخوان پر نظر آیا ہو۔ سارا

گھر بجلی کے تسموں سے جگمگا رہا تھا۔



چند فسادیوں نے رنگ میں بھنگ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ شادی میں قانوناً مقرر کی ہوئی تعداد سے دس گنا مہمان تھے۔ بد تمیزوں نے موٹریں گن ڈالیں اور پولیس تک پہنچ گئے بڑی بے عزتی ہو گی۔ مولوی صاحب نے قسمیں کھا کھا کر اخباروں میں تردید کی مگر کافی ہلڑ مچا۔ پھر جیسے سارے ہنگامے اٹھتے ہیں اور خود بخود بیٹھ جاتے ہیں یہ ہنگامہ بھی بلبلے کی طرح بیٹھ گیا۔ اگر اس وقت مولوی صاحب کے ساتھ بچن بابو اور ان کے بار سوخ دوست نہ ہوتے تو غریب الٹے ٹنگ جاتے۔ اللہ رحیم و کریم ہے۔ وہ سب کے عیب ڈھکتا ہے۔ اخبار تھوڑے دن چیخ چلا کر دم توڑ گئے ورنہ سنا تھا وزیراعظم ننگی تلوار ہیں۔ کسی کو نہیں بخشیں۔ لیکن بچن بابو نے بڑے بڑے زہریلے ناگ کھلائے تھے اور یار دوستوں کو بھی صاف بچا لاتے تھے۔ دراصل ان ہی دنوں ایمرجنسی لگی تھی۔ اخباروں کے گلے گھٹ رہے تھے۔ صرف وہ اخبار رنگ جمارے تھے جو ایمرجنسی کے گن گانے کو تیار تھے نہ جانے کیسے بچن بابو نے مولوی صاحب پر کئے جانے والے اعتراضات کو اقلیت کے خلاف پروپیگنڈے کا روپ دے کر ساری مخالفتیں دبا دیں۔

اسی رات مولوی صاحب نے ایمرجنسی پر ایک شاندار نظم لکھی جس میں انہوں نے اس نئے قانون کو ملک کی قسمت کی روشن ترین کھڑکی سے تعبیر دی۔ جس کے ذریعے ایسی لعنتیں دور ہوئیں اور جتنی نعمتیں اندر آئیں۔ ملک کے دشمن اور انسانوں کا خون چوسنے والے اسمگلروں، ذخیرہ اندوزوں اور منافع خوروں کو کیفر کردار کو پہنچا دیا گیا اور کچھڑے ہوئے طبقے کے نمائندوں اور اقلیتوں کے حقوق کے ساتھ انصاف ہوا۔ ان کے حق ان کو مل رہے ہیں۔ غریبی تیزی سے غائب ہو رہا ہے اور عام انسان خوب پھل پھول رہا ہے۔

اسی شام انہوں نے اپنے نوکر چھوٹو کو چھڑی سے اتا مارا کہ وہ ادھ مرا گیا اس نے بیگم کے کانوں کی بالیاں چرائی تھیں۔ چھوٹو کو پولیس لے گئی۔ اور مال اگلوانے لگی۔

رات کو جب ان کی بیٹی صغریٰ اپنی سیلی کی پارٹی سے لوٹی تو اس کے کان



میں اپنی بالیاں جگمگاتی دیکھ کر بیگم کو پسینہ آگیا۔  
مگر اب کیا ہو سکتا ہے بیگم؟ کیس پولیس کے ہاتھ میں چلا گیا۔ بڑی بدنامی ہو گی۔“

مولوی صاحب نے سمجھایا۔

بیٹی کی شادی تو دھوم دھام سے ہو گئی۔ مگر بیگم کچھ اکھڑ گئیں۔ ان پر خدا جانے کیوں ایک دم جمالت کا بھوت سوار ہو گیا۔ شادی میں بڑے ہی پھوہڑپن اور کوتاہ اندیشی کا ثبوت دیا۔ اول تو باہر ہی نہ نکلیں، ہو سٹس کی غیر موجودگی میں ظاہر ہے۔ محفل سونی اور بے رنگ رہی۔

بچن بابو کی گرل فرینڈ نرملا کنہ نے اگر مورچہ نہ سنبھال لیا ہوتا تو بھد اڑ جاتی مسز بچن مونہ تھو تھائے مسز رفاقت کی پارٹی میں شامل رہیں۔ نرملا کنہ نے ہر کئی کو پورا کر دیا۔ بھلائے/بھلائے

شادی کے بعد اور ہنگامے ٹھنڈے پڑ گئے۔ مگر مولوی صاحب بچن بابو کی بات کے قائل ہو گئے کہ بغیر ایک حسین اور جوان ہو سٹس کے ان کی پر سلیٹی نہیں چمک سکتی۔ یہ بیگم کے بس کا روگ نہیں۔ کافی سیٹ بیک کا اندیشہ ہے۔ بیگم کا سلیقہ گھر کے دائرے تک محدود رہا ہے۔ ہائی سوسائٹی میں وہ الٹ جاتی ہے اور مولوی صاحب پر شبہ کرنے لگتی ہے۔ کہیں نہ کہیں ایسا جھول ڈال دیتی ہے کہ اپر کلاس کے لوگ کھٹک جاتے ہیں۔ ملگجاپتلی گوٹ کا پرانا پاجامہ پننے بادلوں کی طرح دوڑتی پھریں۔ اگر نرملا کی طرح کاسنی شرارے والا جوڑا پہن لیتیں تو خاصی جم جاتیں۔

کتنی تعلیم یافتہ اور حسین لڑکیاں شادی کے مارکیٹ میں طاق پر رکھی سز جاتی ہیں۔ کوئی نوکری کے بھاری بھر کم دولہا کا انتظار کرنے لگتی ہیں۔ اسکولوں اور دفتروں کی نوکریں بور کر دیتی ہیں۔ لیکن پرائیویٹ سیکرٹری ٹائپ کی نوکریاں کافی دلچسپ اور باعزت سمجھی جاتی ہیں۔ بہت سے سمجھ دار لوگ ایک آدھ فلیٹ گھر کے علاوہ بیوی سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ جہاں یار دوستوں کی خاطر وغیرہ میں بڑی سہولت



رہتی ہے اس فلیٹ کو جو اکثر خالی پڑا رہتا ہے کسی جاذب ہوسٹس کے وجود سے سنوار دیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں بزنس کی بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو گھر میں نہیں کی جاتیں۔ پینے پلانے کی دعوتوں میں جب کچھ یار دوست رنگ میں آ جاتے ہیں تو بیوی بچوں کی موجودگی میں بات کرنا مناسب نہیں رہتا۔

بچن بابو کی رائے سے مولوی صاحب نے ایک فلیٹ زملا کی جگری دوست سروج بھائیہ کے نام سے لیا اور فرنش بھی سروج کے ذوق کے مطابق کرا دیا۔ بیگم عموما پینے پلانے کی محفلوں میں بادھا ڈال دیتی تھیں۔

”کیوں جی یہ ہوا اور کئی چڑھائے گا۔ مرکھنے ہاتھی کی طرح جھوم رہا ہے۔“ وہ کہتیں اور مولوی صاحب بڑی مشکل سے انہیں ٹال دیتے۔ ”ارے بھائی کاغذ کا کوٹا ملتا تھا۔ اس کا بڑا حصہ بلیک میں بیچ دیا جاتا تھا۔ اسی سے تو اخبار کا خرچ نکلتا تھا۔ جو زیادہ تر مفت بانٹا جاتا تھا۔“

سروج جس اسکول میں پہلے کام کرتی تھیں۔ وہ ایک توپارٹ ٹائم جاب تھا۔ اور گھر سے بہت دور پڑتا تھا۔

سروج بھائیہ کمال کی ہوسٹس ثابت ہوئیں۔ مولوی صاحب کے دوست احباب کا دائرہ کافی پھیل چکا تھا۔ بڑی بڑی کمیٹیوں پر پہنچ گئے تھے۔ ان کی گرل فرینڈ برابر کی حق دار مان لی گئیں۔ بیگم کو لوگ بھول بیٹھے۔ مس سروج بھائیہ بالکل مشنروں کی بیگموں کی طرح صدارت کرنے لگی۔ اسکولوں کالجوں میں انعامات بانٹنے اور لیکچر دینے لگی۔۔۔۔۔

بیگم بہت بدلیں۔ مگر مولوی صاحب نے سختی سے سمجھایا کہ سروج بھائیہ کا وجود ان کی پوزیشن قائم رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ بے چاری بیگم روپیٹ کر بیٹھ رہیں۔ بیٹیاں بیاہ دی تھیں۔ لڑکے عموما ”ولایت کے چکروں میں رہتے۔ دھند دھار فلیٹ پر پڑی کھیاں مارا کرتی تھیں۔ ساری ہو حق سروج بھائیہ کے فلیٹ میں ہوتی خود ان کی بیٹیاں ان سے کترانے لگیں۔ وہ جب بھی میکے آتیں۔ بیگم مس سروج کا دکھڑا رونے لگیں۔ جبکہ دوسرے فلیٹ میں رنگا رنگ کے ہنگامے رہتے



تھے بڑے کا۔ آدمی جمع ہوتے تھے، واں بیٹیوں کو اپنے شوہروں کا مستقبل سنوارنے کی امیدیں تھیں۔ اس لئے وہ پاپا کی گرل فرینڈ کے ارد گرد منڈلایا کرتیں۔

مولوی صاحب کا ایک پاؤں دہلی میں رہتا تھا۔ بیس نکاتی پروگرام کامیاب بنانے میں وہ سر پیر سے جئے ہوئے تھے۔ یوتھ کانگریس کے بڑے زبردست حمایتیوں میں گنے جاتے تھے۔ وہی یوتھ کانگریس جو مستقبل کی تقدیر سنوارے دے رہی تھی۔ جو دیش کی کایا پلٹ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی وہی بنجے گاندھی جنہیں ورثے میں قوم کی خدمت کا جذبہ ملا تھا۔ مولوی صاحب سے بنجے جی بڑے بے تکلف تھے۔ جب ملتے پیٹھ پر ڈھپ مار کر نہایت پیار سے کہتے ”ہیلو ایڈیٹ کیا حال چال ہے مولوی!“

”آپ کی دعا ہے۔“ مولوی صاحب گھکھیاتے۔

نس بندی پر ان کی نظمیں باقاعدگی سے چھپا کرتی تھیں۔ ان میں سے یوتھ کانگریس کی کارگزاریوں کا نمایاں طور پر ذکر ہوتا، جن کے ناخدا بنجے گاندھی تھے جو دیکھتے دیکھتے دیس پر خدا کی رحمت بن کر طاری ہو گئے تھے۔ سروج بھائیہ نے رخصانہ سلطانہ سے بہنایا جوڑ لیا تھا۔ دونوں مل کر دیس سدھار کے پروگرام بنایا کر لیا۔ بڑے زور شور کی محفل جمی تھی۔ مس سروج بھائیہ کا جنم دن تھا۔ کاگ پر کاگ اڑ رہے تھے۔ دور چل رہے تھے۔ جب سے ڈاکٹروں نے رائے دی تھی۔ مولوی صاحب منہ جھٹائے لگے تھے اور دو چار پیگ لے لیا کرتے تھے۔

”کیا رائے ہے؟“ بچن بابو نے پوچھا۔

”کس بارے میں؟“

”یہ جو مارچ میں الیکشن ہو رہے ہیں۔“

”میڈم اپنی کامیابی کے پورے یقین کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتیں۔“

”مگر الیکشن کی اس وقت کیا ضرورت ہے۔“

اس الیکشن سے وہ صرف یہ ظاہر کرنا چاہتی ہیں کہ ان کی پوزیشن کتنی محفوظ

\_\_\_\_\_ ہے۔



د) { ”اور جو کانگریس ہار گئی تو؟“  
 { ”کل آپ کہیں گے سورج مغرب میں نکلا تو؟“  
 ”مگر دشمنوں کو آزاد کر دیا ہے یہ کہاں کی عقلمندی ہے؟“  
 ”ارے ان دشمنوں میں دم نہیں کاٹھ کے  
 ہار چکے ہیں۔۔۔۔۔“

سب نے مس سروج سے گانا سنانے کی فرمائش شروع کر دی۔ اور بات ٹل گئی۔

مولوی صاحب بیٹھے اگلے شمارے کا ایڈیٹوریل لکھ رہے تھے۔ قرآن اور حدیث کے حوالوں سے انہوں نے ثابت کر دیا تھا کہ اسلام نس بندی کا حامی ہے۔ بڑے معرکے کا مضمون بندھ رہا تھا کہ بچن بابو بوکھلائے ہوئے آئے بال بکھرے ہوئے کپڑے گرد آلود حواس گم۔

”کچھ موسم کی بھی خبر ہے۔“  
 ”کیا ہوا؟“

”وہ جس کا خواب میں بھی گمان نہ تھا کہ رائے بریلی سے سیدھا چلا آ رہا ہوں۔۔۔۔۔“  
 ”اچھا؟“

”میاں جی، کانگریس کا تختہ ٹوٹ گیا۔“  
 ”اماں گھاس کھا گئے ہو؟ بریلی تو میڈم کا گڑھ ہے۔“  
 ”ارے بھائی، لوگ تو دیوی جی کا نام سننے کو بھی تیار نہیں۔ دیکھئے نامیری کیا مٹی پلید کی ہے۔ موٹر کے شیشے توڑ ڈالے بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔“  
 ”تو تم خواہ مخواہ حواس باختہ ہوئے جا رہے ہو۔“ ارے دو چار غنڈے اودھم مچا رہے ہوں گے۔“

”سارا ملک غنڈہ گردی پر تلا ہوا ہے خاک ڈالنے اس ایڈیٹوریل پر۔ یہ اب نہیں چلے گا۔“



”مگر پہلی قسط تو پریس میں گئی، اور چھپ بھی گئی، تم خواہ مخواہ ذرا سی بات پر ہول کھانے لگتے ہو۔“

”دیکھئے مولوی صاحب میں ذمے دار نہیں۔“ بچن بابو ایک دم اٹھ کر چل دیئے۔

اور ایوننگ نیوز میں آگیا کہ بچن بابو نے جتنا پارٹی جوائن کر لی۔ مولوی صاحب کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ لاشتم پشتم بچن بابو کے ہاں دوڑے گئے۔

”آپ کا کیا ہے، مولوی صاحب۔“ وہ بولے۔ ”آپ اقلیت کے نمائندے ہیں آپ کی تو ہر حکومت میں کھپت ہو جائے گی ذرا سے الٹ پھرنے کا ممکن جائے گا۔ مصیبت تو میری ہے کیونکہ میں تو دیوی جی کی ناک کا بال تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یوں میری ساری دوڑ بھاگ خاک میں مل جائے گی۔“

اور مولوی صاحب نے بڑی تیزی سے الٹ پھیر شروع کر دی۔ ایڈیٹوریل پھاڑ دیا گیا۔ مشین پر چڑھا ہوا شمارہ راتوں رات جلا دیا گیا۔ ساری نقصان دہ تصویریں گھر کے کونے کونے سے اتاری گئیں۔ ان کی گھر میں موجودگی خطرے سے خالی نہ تھی۔ بیگم نے سنہرے فریم میں جڑی میڈم کی اور اپنی تصویر کھسوٹ کر مدینہ شریف کا رنگین فوٹو لگا دیا۔

دوسرے دن ایک بہت بڑے جلسے میں مولوی صاحب نے ایمر جنسی کی درندگی پر مدلل تقریر کی اور جتنا پارٹی کو ڈیموکریسی کا محافظ، عوام کا ہمدرد اور انسانیت کا علمبردار ثابت کر دیا۔

اور جتنا پارٹی نے انہیں لپک کر فوراً گلے لگا لیا۔  
اللہ تعالیٰ بڑا کار ساز ہے۔ وہ سب کی ناؤ پار لگا دیتا ہے۔





یہ درحقیقت افسانہ نہیں ہے۔ یہ پرائیویٹ فکشن میں  
جو جنسی بارہا ہوسنی لڑائی خاندانوں میں دراکھی جاتی  
تھی۔ اس کا ذکر ہے اور اس کا ذکر المدنی پختہ مسلم  
اپنے خاندانوں پر کرتے ہیں۔ یہ عورت کی زندگی کی  
کئی پریمی عورتوں کی تصویر ہے۔ اس طرح عورت  
کی خوشبو کا عرف ان کی طرف سے بھاجا جاتا تھا۔

اس وقت کے

ایسے زمانے میں عورت کی خلیجی فکشن کا فقدان یا  
اختلاف پذیر ہونا کامیابی نہیں ہے۔

بدن کی خوشبو

عورت نے اپنے بدن کی خوشبو کو شاید  
مطلوع و افلاقی زینت بننے کی کوشش کی ہوگی۔ ایسے  
زمانے میں جس نے زبان و بیان کی خوشبو کو اپنے بدن کی خوشبو  
کمرے کی نیم تاریک فضا میں ایسا محسوس ہوا جیسے ایک موہوم سایہ  
آہستہ دبے پاؤں جھمکن میاں کی مسہری کی طرف بڑھ رہا ہے۔

سائے کا رخ جھمکن میاں کی مسہری کی طرف تھا۔ پستول نہیں شاید حملہ آور  
کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ جھمکن میاں کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ انگوٹھے اکڑنے  
لگے۔ سایہ پیروں پر جھکا۔ مگر اس سے پہلے کہ دشمن ان پر بھرپور وار کرتا۔ انہوں  
نے پول جمپ قسم کی ایک زبردستی لگائی اور سیدھا ٹیوٹے پر ہاتھ ڈال دیا۔

”جیس“ اس سایے نے ایک مری ہوئی آہ بھری اور جھمکن میاں نے غنیمت کو  
قالین پر دبے مارا۔ چوڑیوں اور جھانجھوں کا ایک زبردست چھٹکا ہوا۔ انہوں نے  
لیک کر بجلی جلائی۔ حملہ آور سٹ سے مسہری کے نیچے گھس گیا۔

”کون ہے بے تو“ جھمکن میاں چلائے۔

”جی میں حلیمہ“

”حلیمہ؟ اوہ!“ وہ ایک دم بھس سے قالین پر بیٹھ گئے۔

”یہاں کیا کر رہی ہے؟“

”جی کچھ نہیں“

”تجھے کس نے بھیجا ہے۔ خبردار جھوٹ بولی تو زبان کھینچ لوں گا۔“

”نواب دلہن نے؟“ حلیمہ کانپی۔



”اف پیاری اور ان کی جان کی دشمن!“ ایک دم انکا دماغ قلاںچیں بھرنے لگا۔  
 کئی دن سے امی انہیں عجیب عجیب نظروں سے دیکھ کر نایاب بو بو سے کانا پھوسی کر  
 رہی تھیں۔ نایاب بو بو ایک ڈائن ہے کبعت۔ بھائی جان بھی گستاخ نظروں سے  
 دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ان سب کی لمبی بھگت معلوم ہوتی ہے۔

نوابوں کے خاندان میں کیا کچھ نہیں ہوا کرتا۔ چچا دادا نے کئی بار ابا حضور کو  
 سنبھال دلوانے کی کوشش کی۔ بد معاش ان کی جان کو لگا دیئے کہ جائیداد پر قبضہ کر  
 کے سب ہضم کر جاتیں۔ رفاقت علی خان کو ان کے سگے ماموں نے زہر دلوا دیا، خود  
 ان کی چیمٹی لونڈی کے ہاتھوں، لعنت ہے۔ ایسی جائیداد پر۔

شاید پیاری امی اپنی ساری جائیداد بڑے صاحبزادے کو دینا چاہتی ہیں کہ اپنی  
 بھتیجی بیاہ کر لائی ہیں تا، اس لئے اس کی جان کی دشمن ہو رہی ہیں۔

چمن میاں کو جائیداد سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ اسامیوں کی ٹھکانی کرتا۔  
 انہیں گھر سے بے گھر کر کے جیسے تیسے لگان وصول کرتا، ان کے ڈھور ڈنگر نیلام  
 کروانا انہیں وحشت ہوتی تھی ان حرکتوں سے۔

اف دنیا میں کسی کا بھروسہ نہیں۔ اپنی ماں اگر جان کی دشمن ہو جائے۔  
 ویسے ہی ہر وقت ٹوکتی رہتی ہیں۔ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، اتنا نہ پڑھو، اتنا نہ کھیلو، اتنا نہ  
 جیو۔

”چاقو کہاں ہے؟“ جحمن میاں نے کہنیوں کے بل جھک کر پوچھا۔  
 ”چاقو“

”ہینڈس اپ“ جحمن میاں نے جاسوسی انداز میں کہا۔

”ایں“ حلیمہ چکرائی۔

”الو کی پٹھی ہاتھ اوپر۔“

حلیمہ نے ہاتھ اوپر اٹھائے تو اوڑھنی پھسل گئی۔ جھینپ کر اس نے ہاتھ  
 دبوچ لئے۔

پھر وہی بد معاشی۔ ہم کہتے ہیں ہاتھ اوپر۔“



”اوں کا نیکو؟ وہ اٹھلائی۔“

”کانیکو کی پچی۔ چاقو کہاں ہے!“

”کیسا چاقو؟“ حلیمہ چڑ گئی۔

”تو پھر کیا تھا تیرے ہاتھ میں!“

”کچھ بھی نہیں، اللہ قسم کچھ بھی نہیں تھا۔“

”تو پھر۔۔۔۔ پھر کیوں ہے یہاں۔“

”نواب دلہن نے بھیجا ہے۔“ حلیمہ نے دبی زبان سے کہا اور آنکھیں جھکا کر

اپنی نتھنی کا موتی گھمانے لگی۔

”کیوں؟“ ہتھمن میاں سہم گئے۔

”آپ کے پیر دبانے کے لئے۔“ وہ مسہری سے ٹک گئی۔

”لا حول ولا قوہ۔۔“

۔۔۔۔۔ چل بھاگ یہاں سے۔“ انہوں نے حلیمہ کی شریر آنکھوں سے

گھبرا کر کہا۔

حلیمہ کا چہرہ ٹٹک گیا۔ ہونٹ کانپے اور وہ قالین پر گھٹنوں میں سردے کر

پھوٹ پڑی۔

”اوہو، رو کیوں رہی ہے۔ بیوقوف گدھی کہیں کی۔“

مگر حلیمہ اور رونے لگی۔

”حلیمہ پلیز حلیمہ۔۔۔۔۔ خدا کے لئے رومت اور جا۔۔۔۔۔ ہمیں صبح

کالج ذرا جلدی جانا ہے۔“

حلیمہ پھر بھی روئے گئی۔

دس برس ہوئے تب بھی حلیمہ اسی طرح روئے جا رہی تھی۔ اس کا باپ

اوندھے منہ لیٹا تھا۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ مگر وہ خون بہت لال تھا۔

اس میں گلابی گلابی گوشت کے ٹکڑے سے ملے ہوئے تھے۔ جو بابا روز بلغم کے

ذریعے اگلا کرتا تھا۔



اسے کلچے سے لگائے جھوم جھوم کر بن کر رہی تھی۔ پھر سب نے ابو کو سفید کپڑوں میں لپیٹا اور ہسپتال لے گئے۔ لوگ ہسپتال جا کر پھر نہیں لوٹا کرتے۔ اور اس دن بھی وہ اسی طرح روئے جا رہی تھی جس دن اس کی اماں نے اسے نواب دلہن کی پٹی تلے ڈال کر اناج سے جھولی بھر لی تھی اور جاتے وقت پلٹ کر بھی نہ دیکھا تھا۔

غلام گردش کے اعلاطے میں حلیمہ جھوٹن کھا کر پلتی رہی۔ اسے نواب دلہن کے والان تک ریف لے آنے کی اجازت نہ تھی۔ گندگی اور غلاظت میں وہ مرغیوں اور کتے کے پلوں کے ساتھ کھیل کود کر بڑی ہوئی۔

بے حیا منوئی حلیمہ جیتی گئی۔ نایاب بو بو کا دس بارہ برس کا لونڈا جبار کیا دھواں دھواں منوئی کو پیٹا کرتا تھا۔ کبھی چمنے سے پیر داغ دیتا، کبھی آنکھوں میں نارنگی کا چھلکا نچوڑ دیتا کبھی خالہ کی نسوار کی چٹکی ناک میں چڑھا دیتا۔ حلیمہ گھنٹوں بیٹھی مینڈکی کی طرح چھینکتی رہتی۔ سارا گھر ہنس ہنس کر دیوانہ ہو جاتا۔

اب بھی ستانے سے باز نہیں آتا تھا۔ ڈیوڑھی پر کچھ دینے لگی۔ چٹکی بھر لی تھنی پکڑ کے ہلا دی۔ کبھی چوٹی کھینچ لی۔ بڑی چلتی رقم تھا۔ نواب صاحب کا ختم تھا تا۔ ان کا بڑا منہ چڑھا تھا۔

نایاب بو بو ایک باندی تھیں۔ کسی زمانے میں بڑی دھار دار، نواب صاحب یعنی بنجمن میاں کے والد ان پر بری طرح لٹو ہو گئے۔ وقتاً فوقتاً نکاح کی دھمکیاں بھی دے دیا کرتے تھے مگر وہ ایک گھاگ تھیں۔

باندی کا نکاح ہو جائے۔ چاہے نہ ہو، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کوئی سرخاب کے پر نہیں لگ جاتے خاندانی نواب زادیاں مرجائیں گی۔ ساتھ نہ بٹھائیں گی۔ قاضی کے دو بولوں میں اتنا دم ڈرود نہیں کہ چٹانوں میں سوراخ کر دیں یا دال روٹی کے سوال کو حل کر دیں۔

نایاب بو بو کے محل میں بڑے ٹھاٹھ تھے۔ بجائے بیگم کی سوت بنے کے وہ نہایت جھانڈی سے کوشش کر کے ان کی مشیر خاص گویاں بن گئیں اور نواب جانشانی



صاحب پر کچھ ایسا جادو کا ڈنڈا گھمایا تھا کہ انہوں نے ان کے بیٹے جبار کے نام معقول اراضی اور باغات کر دیئے تھے۔ سارے نوکر اس سے لرزتے تھے۔ بوکسی کی قبض اور ولاکتی پتلون چڑھائے ڈنڈا پھرتا تھا۔ نام کو ڈرا سورا تھا، مگر رعب سب پر جماتا تھا۔ اندر بوبو اور باہر جبار جو نصیبوں کا مارا ان دو پاٹوں کے بیچ آجاتا، ثابت بیچ کرنے جاتا۔

حلیمہ روئے چلی جا رہی تھی۔

بچھمن نے ڈانٹا تو ریزہ ریزہ ہو گئی۔ تھک کر چمکارا تو بالکل ہی بہہ گئی۔ اس کے سرد ہاتھ پکڑ کر فرش سے اٹھایا تو ڈٹ کر ان کے سینے لگ گئی۔  
اللہ! جاڑوں کی ہو شر یا راتیں، طوفان کی گھن گرج اور بچھمن کے ناتجربہ کار ہاتھوں میں بکھری ہوئی حلیمہ!

یار لوگوں نے لونڈیوں کو ٹھکانے لگانے کے کتنے گر بتائے تھے، مگر حماقت کہیے یا پھوٹے نصیب، بچھمن نے ہمیشہ لغو بات کہہ کر سنی ان سنی کر دی۔ اپنی کورس کی کتابوں اور کرکٹ کے علاوہ ان کی کسی بھی شے سے گہری شناسائی نہ تھی۔ کڑکڑاتے جاڑوں میں روئے کی ڈلی حلیمہ نے انہیں جھلس کر رکھ دیا۔ ہاتھ جیسے سریش کی تھالی میں چپک گئے۔

پھر نہ جانے دماغ کے کس کونے میں نشتر سا لگا، اچھل کر دور جا کھڑے ہوئے۔ غصہ سے تھر تھر کانپنے لگے۔

باہر طوفان رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا اور حلیمہ کی سسکیاں تلاطم برپا کئے دے رہی تھیں۔

”حلیمہ مت رو، پلیز! وہ تنگ آکر اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ گئے۔ جی چاہا اس کے سینے پر سر رکھ کر خود بھی دھاڑیں مار مار کر روئیں، مگر ڈر تھا کہ پھر سردہاں سے اٹھنے کا نام نہ لے گا۔ اپنے کرتے کے دامن سے اس کے آنسو پونچھے۔ اسے اٹھایا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی، باہر دھکیل کر اندر سے کنڈلی چڑھالی۔  
غیند تو حلیمہ کے آنسو بہا لے گئی تھی۔ صبح تک بچھمن میاں لجاف میں پڑے



کانپتے رہے۔ اور زہر میں بجھے آنسو بہاتے رہے۔

باہر جھنجھلائی ہوئی ہوا بگڑ کر پیڑوں سے لڑتی رہی۔ کراہتی رہی۔

نایاب بوبو نے سلام پھیرا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے جائے نماز کا کونہ پلٹ کر وہ انھیں اور ہولے ہولے سے دروازہ کھول کر جبار کے کمرے میں جھانکا۔ بیٹے کے وجہہ جسم کو دیکھ کر ماما سے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

دبے پاؤں وہ اندر آئیں۔ جھمن میاں کے والد نواب فرحت اور جبار کے باپ کی نئی باندی گل تار چوری چھپے روز جبار کے پاس آتی، نشانیاں چھوڑ جاتی تھی۔ آج بھی لحاف میں سے دوپٹہ لٹک رہا تھا۔ انہوں نے دوپٹہ کھینچا۔ یہ نامراد کسی دن ناک چوٹی کٹوائے گی۔ اللہ جبار کو نظر بد سے بچائے۔ ہو ہو باپ کا نقشہ پایا ہے۔

اچانک نایاب بوبو فلکے منڈ ہو گئیں۔ باپ کی لونڈی ماں برابر ہوئی کہ نہیں؟ فتویٰ لے لیا جائے عالم صاحب سے، تو جی کا ہٹول کم ہو۔ یہ کیا کہ دنیا تو گئی، عقبی میں بھی انگارے ہی انگارے۔ نگوڑی گل بہار کا بھی کیا قصور، کہاں وہ بوا سیر کے مارے کھوسٹ نواب فرحت اور کہاں یہ کڑیل جوان۔ رات کیا چمکی چمکی روتی تھی۔ کو ایڈ بھڑنے کا بھی ہوش نہیں اس لڑکے کو۔ بوبو کی غیند کچی نہ ہو تو نہ جانے کسی کی نظر ہی پڑ جائے۔ اللہ پاک سب کا رکھوالا ہے۔

نایاب بوبو نے جبار کے لئے باقاعدہ باندیاں خریدیں، ایک جا پے میں جاتی رہی، دوسری مہتر کے لونڈے کے ساتھ نکل گئی۔ اس حرافہ نے جی کا چین اڑا دیا تھا۔ شریف گھرانوں کی باندیاں ایسی اچھاں چھکا نہیں ہوتیں۔

کئی بار چاہا کہ بیگم سے حلیمہ مانگ لیں۔ مگر ہمت نہ پڑی۔ ”نہیں“ حلیمہ تو حیرے نچرن کے لیے ہے۔ ”بیگم کو ضد ہے۔ آج ان کی ضد پوری ہوگی ویسے جبار کو مسمی لونڈیاں پسند بھی نہیں۔ باپ کی طرح تنتیا مرچ چاہئے۔“

بڑبڑاتی ہوئی نایاب بوبو باندیوں کے کوٹھے میں پہنچیں تو ان کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔



حلیمہ سروری کی رضائی میں دبکی پڑی تھی۔ سیلپر کی نوک سے انہوں نے حلیمہ کے چھانجن میں ٹھوکر ماری اور رضائی کا کونہ پکڑ کر کھینچ لیا۔  
حلیمہ گھبرا کر جاگ پڑی اور غافل سوئی ہوئی سروری کے نیچے سے اپنا دوپٹہ کھینچنے لگی۔

بوبو کی چیل جیسی آنکھیں حلیمہ کے جسم پر ٹانگے بھرنے لگیں۔ حلیمہ چوروں کی طرح سر جھکائے میلی تو شک میں لگے ٹانگے گننے لگی۔

”ہوں!“ بوبو نے کمر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا:

”میں نے کیا کہا تھا تجھ سے۔“

”جی بوبو۔“

”تو؟“

حلیمہ چپ رہی۔

”اری نیک بخت منہ سے تو کچھ پھوٹا کیا بولے؟“

”ان کے پیروں میں درد نہیں تھا۔“ حلیمہ کا سر جھک گیا۔

”ہوں۔ بوبو تسبیح گھماتی ہوئی مڑ گئیں۔ دل میں آپ ہی آپ کلیاں کھلنے

لگیں۔ خیر سے بس اب تو نواب فرحت کا نام چلانے والا جبار رہ گیا۔ خدا کی شان

ہے بڑے صاحبزادے کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ گلوڑی صنوبر اتنی عمر ہی لے کر آئی

تھی۔ مشکل سے چودھواں سال لگا ہوگا۔ کہ صاحبزادے کو پیش کر دی گئی۔ کیا پھول

سی پچی تھی، ہمیشہ کی دھان پان۔ ماں باپ کا پیار ملتا ایک، نہ ایک دن باہل کا گھر

چھوڑ کر شہنائیوں کے سریلے کانوں میں بسائے سیرال سدھار جاتی۔ جہاں دو دل

ملتے، ایک گھر بنتا۔ ایک دنیا بستی۔

صنوبر کو بچپن سے ہی دلہن بننے کا ارمان تھا۔ جب دیکھو بانندیاں جمع ہیں۔

بڑی سبیل سی پچی تھی۔ چھوٹی بڈی، کھنچا ہوا بدن، چھوٹے ہاتھ پیر منے۔ سبز چھدرے

دانت۔ دیوی جیسی روشنی انکھریاں۔ کتنا کتنا جبار کے لئے چاہا۔ بیگم اڑائیں، ان

کے ماتکے کی باندی ہے۔



ماموں جان سے بیٹے کے لئے مانگ کے لائی ہیں۔

یہ کون کہتا ہے۔ صنوبر دلہن نہیں بنی۔ بو بو پشیتی باندی تھیں۔ انہیں خوب احساس تھا کہ ہر عورت دلہن بننا چاہتی ہے۔ باندی ہے تو کیا عورت نہیں، اس کے سینے میں بھی دل ہے ارمان ہیں۔ سرشام ہی سے انہوں نے صنوبر کو نسلہ دھلا کر صاف ستھرا پیازی جوڑا پہنایا، اپنے ہاتھوں سے مندی توڑ کر پسوائی، خوب رچی تھی، بد نصیب کے ہاتھوں پیروں میں، خوشبو دار تیل ڈال کر چوٹی گوندی جس میں ٹول کا موباف ڈالا۔ سیلیاں کانوں میں الٹی سیدھی کھسر پھسر کر کے اسے ستاتی رہیں۔ جب پیروں سے اٹھا کر بچمن میاں کے بڑے بھائی حشمت میاں نے اسے کلیجے سے لگایا تو گھوڑی نے ننھا سا گھونٹ نکال لیا تھا۔

چودہ برس کی صنوبر جس نے حشمت میاں کا منہ دیکھ کر جانو ملک الموت کا ہی منہ دیکھ لیا سال کے اندر گابھن ہو گئی۔ پھلکی کیلی مرگھلی سی بچی سارا دن منہ اونڈھے پڑی بلکائیاں لیا کرتی۔ اللہ لوگوں کے کیسے کیسے ناز نخرے ہوتے ہیں۔ میکے سسرال والے صدقے داری جاتے ہیں۔ جب اچھی بھلی تھی۔ نوابزادے سے ہاتھ جڑوا لیتی تھی تب ذرا مسکراتی تھی۔ ایک ایک پیار کے لئے ناک رگڑواتی تھی۔ جب سبھی سے اتری تو میاں گھن کھانے لگے محل کا دستور تھا جب گائیں بھینسیں گابھن ہو جاتی تھیں انہیں گاؤں بھیج دیا جاتا تھا۔ دو دھاری ہوئی کہ واپس بلا لی گئیں۔ لونڈیاں باندیاں بھی جب بے کار ہو جاتی تھیں تو گاؤں میں ڈلوا دی جاتی تھیں بچہ جن کے وہیں ملنے کو دے آتی تھیں تاکہ محل والوں کو گاؤں کاؤں سے وحشت نہ ہو۔

بڑا فیل مچاتی تھیں نامرادیں، بھینس کی طرح نکھرے کی یاد میں اراتیں، دودھ بھر کے بخار چڑھتے، تب انہیں کسی بیگم کا بچہ ہلکا دیا جاتا۔ دودھ پلاء کے عیش اڑانے کو ملتے اپنا بچہ بھوکا اسی سے مانوس ہو جاتیں، مگر نواب زادیاں گائے بکریوں کی طرح تھوڑے ان کے لئے بچے جننے بیٹھیں گی۔ زیادہ تر رو پیٹ کر خشک ہو جاتیں اور پھر کام سے لاد دی جاتیں۔۔۔۔۔ مگر صنوبر اڑ گئی کہ گاؤں نہیں جاؤ گی۔



نایاب بوبو نے بہتیرا سمجھایا پر بیگم کے قدم سے لپٹ گئی۔ بوبو دنیا دیکھے ہوئے تھیں۔ لونڈیوں سے انہیں نفرت بھی تھی کہ اپنے وجود سے ہی نفرت تھی۔ مگر ان سے ہمدردی بھی تھی۔

مگر صنوبر کی گھڑی آگئی تھی، نہ مانی اور حشمت میاں کا منہ کڑوا کرتی رہی کوئی دوسری سمجھاتی تو اس کا منہ نوج ڈالتی۔

ایک دن نجانے کس بات پر زبان چلانے لگی۔ صاحبزادے کو تاؤ آگیا۔ ایک لات جو کس کے رسید کی تو گری جا کے موری میں۔ بے ڈھب بڑ گئی لات۔ تین دن بھینس کی طرح اراتی رہی۔ کوئی ڈاکٹر بلاتے تو فیتہ کھڑا ہو جاتا۔ پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔ لوگ ویسے ہی دشمن ہیں۔ خیر سے تیسرے دن صنوبر نے غلام گردش کی سب سے تاریک کوٹھڑی میں دم توڑ دیا۔

صنوبر تھکی پورم پوڑ جادو گرئی، نجانے کیا کر گئی کہ چار سال حشمت میاں کی شادی کو ہو گئے۔ مگر اولاد کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ کیسے کیسے علاج ہوئے تھے۔ تعویذ گنڈے ہوئے، مزاروں پر منتیں چڑھائیں، مندروں میں دیئے جلائے۔ دلہن بیگم کا پیر بھاری نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ سچ کہ جھوٹ دشمن بیری کہتے ہیں۔ صاحبزادے نے بھری کوکھ لات مار دی تھی۔ اس کارن نامراد ہو گئے۔ جب ہی تو بیگم دلہن کو ہسٹریا کے دورے پڑتے ہیں۔ اور دوڑ دوڑ کے میکے جاتی ہیں۔ وہاں ان کے خلیرے بھائی سنا ہے بڑے عمدہ ڈاکٹر ہیں۔ وہی ان کا علاج کر رہے ہیں اور سنا ہے کچھ اور کھٹ پٹ بھی ہے دونوں میں۔

نایاب بوبو نے ٹھنڈی سانس بھری، بیگم نواب کا منہ ہاتھ دھلانے کے لئے گرم پانی سمویا اور ان کی خواب گاہ کی طرف چل دیں۔

بیگم نواب کو پہلے تو نایاب کے وجود سے کوفت ہوئی تھی، مگر جب وہ قدموں میں بچھ گئی اور یقین دلایا کہ نواب دولہا کی باندی نواب دلہن کی باندی ہے۔ وہ کوئی رنڈی خانگی نہیں۔ نہ نگوں سے خریدی لونڈی ہیں۔ نجانے پشت ہا پشت سے کتنے نوابوں کا خون ان کی رگوں میں موجزن ہے۔ ناچار بیگم کو ماننا پڑا۔ ویسے اب کچھ



اندھیرا بھی نہ تھا۔ خاندان کے سب مرد ادھر ادھر منہ مار لیتے ہیں۔ تاہم نایاب بوبو  
نے بھی کبھی حد سے آگے پیرو نہ نکالے۔ نواب کے بیٹھے بول اس کان سنتی اس کان  
اڑا دیتی جب نواب منور مرزا کے چکر میں پھنسے تو انہوں نے باقاعدہ بیگم کے ساتھ  
مل کر مورچہ سنبھالا۔ بیگم کی بے دخلی پر خوش ہونے کی بجائے آٹھ آٹھ آنسو  
روئیں۔ ان کا اور بیگم کا نواب سے اٹوٹ ناٹھ تھا، مگر یہ ٹھنکیائی کون ہوتی ہے۔  
جاگیر کے کوڑے کرنے والی۔ وہ تو چلتی ہوا کا جھونکا تھا۔ آج اس رخ کل اس  
رخ۔

انہوں نے بیگم کے ساتھ مل کر محاذ پر بہت حکمت عملی سے کام لیا۔ اور  
 سردار خان کو راکھی باندھ کر بیگم نواب کا بھائی بنا دیا۔ طرحدار خان منور کو ساتھ  
لے کر پیرس چلا گیا۔ اور جب منور غارت ہوئی۔ تو نایاب نے اپنے ہاتھوں سے بیج  
سجائی بیگم کو از سر نو دلہن بنایا۔ انہوں نے بیگم کو پھولوں کے گہنے کے ساتھ دو موتی  
بھی کان میں ڈال دیئے کہ نواب فرحت کو کیسے خوش کرنا ہے۔ اور غلام گردش کی  
اندھیری کو ٹھڑی میں جبار کو کلیجے سے لگائے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔  
وہ دن اور آج کا دن، نایاب بوبو نے بیگم نواب کی خدمت نہ چھوڑی۔  
بوبو کو منہ لٹکائے دیکھ کر بیگم نواب کا ماتھا بھی ٹھنکا۔  
 خیریت تو ہے۔

رک رک کر بوبو نے تمام تفصیل بتائی۔ بیگم کے پیروں تلے سے زمین  
 کھسک گئی۔ فوراً جبار کو موڑ دے کر بھیجا کہ حکیم کو لا دے۔ حکیم صاحب بولے۔  
 پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ دلہن بیگم، بچہ نا تجربہ کار ہے۔ کمن ہے،  
 پھر بھی احتیاطاً، کچھ مقویات مع تفصیل کے غلام صاحبزادے کی خدمت میں بھجوا  
 دے گا۔ اس کے علاوہ سرکار ہو سکتا ہے کہ کسی وجہ سے کراہیت آتی ہو۔ بعض  
 وقت ماخضہ کچھ اس ڈھنگ سے پیش کیا جاتا ہے کہ رغبت نہیں ہوتی، اس کا یہ  
مطلب نہیں کہ معدہ ناکام ہو چکا ہے۔  
 حکیم صاحب نے عرض کیا۔



”میں پہلے ہی کھٹکی تھی حضور، لونڈیا میں کچھ کھوٹ ہے، نوابزادوں کے مزاج کے لائق نہیں۔ سوکھی ماری مرگھلی، میری مانے تو سرکار اس نامراد کو باقر نواب کو دے ڈالے۔ کئی بار کہہ چکے ہیں ان کے ولایتی کتوں کی جوڑی حشمت میاں کو پسند ہے۔ وہ بخوشی تبدیل کر دیں گے۔ بوبو بیگم کی پنڈلیوں کو دبانے لگیں۔

”اے ہے نوج، میں موئی کو زہر دیدوں گی مگر اس کو ڈھی کو نہ دوں گی، موا سڑ رہا ہے سر پر سے“ ایسا اندھیر تو خاندان میں کبھی نہیں ہوا کہ لونڈی جائے اور صحیح سلامت لوٹ آئے۔

تکلفات خیال کئے بغیر ہی پیش دستی کر بیٹھتے ہیں۔ کہیں بھائی بھائی میں رقابت نہ ٹھن جائے۔ اس لئے گھر بیگمیں احتیاط سے بٹوارہ کر دیتی ہیں۔ پھر مجال ہے جو دوسرے کی باندی پر کوئی ذانت لگائے۔ بالکل قانونی حیثیت ہوتی ہے اس گھریلو فیصلے کی۔

”میں تو عاجز ہوں اس لڑکے سے، اٹھارہ انیس کا ہونے کو آیا۔ کیا مجال جو کسی لونڈی بانڈی کو چھیڑا ہو کہ چٹکی بھری ہو۔ ہمارے بھائی تو ادھر دس بارہ کے ہوئے اور خرمستیاں شروع کر دیں سولہ سترہ کے ہوئے اور پھیل پڑے۔ اے نایاب نگوڑی ڈھنگ سے نہائی دھوئی بھی تھی کہ تم نے ہلدی لسن میں سڑتی ہوئی میرے بچے کی جان پر تھوپ دی۔ بیگم نواب بولیں۔

”اے حضور مجھے اناڑی سمجھا ہے؟ اللہ کی عنایت سے ان ہاتھوں نے ایسی کیسی باندیاں سنواری لونڈیا کی ایڑی دیکھ کر مرد ذات کوہ قاف کی پری کو نہ پوچھے۔ حشمت میاں فرنگن سے پھنسنے کو ہو رہے تھے۔ مگری میرے ہاتھ کی صنوبر سورات ہوئی کہ نہیں؟“ بوبو اپنے فن پر آنچ آتے دیکھ کر بڑی چراغ پائیں۔

اے قربان جاؤں بیگم، آپ کا لال جوانوں کا جوان ہے۔ دن بھی تو اب خراب ہیں۔ پچھلے دنوں بھاری قیمت دے کر دو باندیاں افضل نواب نے خریدیں، پولیس نے ناطقہ بند کر دیا۔ بہت کچھ کھلایا پلایا، بہت کہا کہ اللہ نام پر غریب لڑکیوں کی پرورش کر رہے ہیں۔ مگر لڑکیاں کسی ہوم سوم میں اللہ ماری پہنچا دی گئیں۔



ڈیڑھ ہزار پر پانی پھر گیا۔ اب نئی باندی ملنا بھی تو مشکل ہے۔

اگر تیسری جنگ شروع ہوتی تو بھی محل میں ایسا طوفان نہ مچتا۔ بات ریگتی ہوئی سارے خاندان میں پہنچ گئی۔ جانو ہر چہار طرف سنپولے چھوٹ گئے۔ ایک سے دوسرے منہ تک جانے میں کتنی دیر لگتی ہے، جس نے سنا، چھاتی کوٹ لی۔

”ہے ہے اچھن میاں۔“

افضل میاں کو پتہ چلا، پانچ پھڑکاتے، پیک کا غرارہ منہ میں سنبھالے آن پہنچے اور سیدھے جھمن کی جان پر ٹوٹ پڑے۔

”اوی ماں ہمیں کیا معلوم تھا۔ یہ قصہ ہے، ورنہ تمہاری بھابی کا پھندا کا ہے کو گلے میں ڈالتے۔ جان من اب بھی کچھ نہیں گیا ہے، بندہ حاضر ہے۔“ کسی زمانے میں وہ جھمن پر بری طرح لٹو ہو گئے تھے بڑے سرکار نے گولی مار دینے کا الٹی میٹم دیا، تب ہوش میں آئے۔ جھمن ان سے بے طرح چڑتے تھے۔

”کو اس مت کیجئے۔ ایسی کوئی بات نہیں، اصل میں مجھے یہ باتیں پسند نہیں، میرا مطلب ہے بغیر نکاح ناجائز ہے۔“

”بالکل جائز نہیں۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے جد امجد سب کے سب حرامکار تھے۔ ایک آپ پیدا ہوئے ہیں۔ متقی پرہیز گار۔“

”میرا خیال ہے کہ۔۔۔۔۔۔“

”آپ کا خیال سالا کچھ نہیں، کبھی ارکان دین کا مطالعہ فرمایا ہے؟“

”نہیں تو، مگر۔۔۔۔۔۔ یہ بات عقل میں نہیں۔“

پتھر پڑ گئے ہیں آپ کی عقل مبارک پر معلوم ہے نہیں کچھ اور آئیں بائیں شلائیں ہانکنے لگے۔

”مگر قانوناً جرم ہے۔“

”ہم یہ کافروں کے قانون کو نہیں مانتے ہم خدائے ذوالجلال والکرام کے حکم پر سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں لونڈی غلام کے ساتھ اولاد جیسا سلوک کیا



جاتا ہے۔ نایاب کو دیکھو، ملکہ بنی راج کر رہی ہے۔ ان کے بیٹے کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، سب ہی باندیوں پر چربی چڑھ رہی ہے۔ ہاں تمہیں سوکھا مارا مال دیا گیا ہے، تو میاں سروری لے لو۔ دُنبہ ہو رہی ہے۔“

”ہشت“

”ہم کہتے ہیں آخر معاملہ کیا ہے؟“

”کچھ معاملہ نہیں، آپ مہربانی فرما کر میرا بھیجانہ چاہئے۔“

”تمہاری مرضی، تم کو جگ ہنسائی کا شوق ہے تو کون روک سکتا ہے، تمہاری مرضی اور سرکار شاید آپ کو پتہ نہیں کہ آپ کی منگیتر۔“

”میری کوئی منگیتر و گیتسر نہیں۔“

”ابھی نہ سہی، ہو تو جائیں گی۔ وہ حرمہ خانم اس لقندر سے بہت میل جول پر رہا رہی ہیں۔ منصور سے۔“

”تو میں کیا کروں۔“

”بتاؤں کیا کرو، ابھی صدر کی طرف کو جا رہا ہوں منہارن کو بھیجے دیتا ہوں، بھر کلائییاں چوڑیاں پہن لو اور کیا۔“ انہوں نے پیک بھرا قہقہہ مارا۔

”جہالت، سب جہالت کی باتیں ہیں۔“

”ہمارے قبلہ و کعبہ جاہل تھے؟۔“

”ہوں گے مجھے کیا پتہ۔“

”ابے کیوں گھاس کھا گئے ہو، بزرگوں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی رواج بنایا، اب تک ہمارے خاندانوں میں اسی پر عمل ہوتا چلا آیا ہے۔ باندی مل جائے تو جوان لڑکے بے راہ نہیں ہوتے بری لتوں سے بچتے ہیں، صحت اچھی رہتی ہے۔“

”یہ سب حرام کاری کو جائز بنانے کے ہتھکنڈے ہیں۔“

”تم کفر بک رہے ہو، مذہب کی تو ہیں۔۔۔۔۔۔“

”ارے جائے بڑے مذہب والے آئے، مذہب کی بس ایک ہی بات دل پر نقش ہے۔“



نالائق بھی ہو اور۔۔۔۔۔ بد تمیز بھی۔ لاحول ولا میری بلا سے تم جہنم میں

جاؤ۔“

رات کو خاصا چٹا گیا تو نایاب بوبو نے بڑے اہتمام سے چاندی کی چمچی میں معجون مرکب جواہر والا چاندی کے ورق میں لپیٹ کر پیش کیا۔ حکیم صاحب کی ہدایات کا پرچہ جھمن سے بے پڑھے پھاڑ دیا تھا اور سروری کو ڈپٹ بتائی تھی۔ جھمن کا جی لپا ہوا کی قاب میں ڈوب مریں۔ انہوں نے معجون کو ہاتھ مار کر گرا دیا۔ اور پیر پٹختے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ساری دنیا ان کو نامرد سمجھ رہی تھی۔

انہوں نے اب تک جتنی علمی اور ادبی کتابیں پڑھی تھیں، سب ہی میں بغیر شادی کئے کسی عورت سے تعلقات رکھنے والے کو زانی اور بدکار کہا گیا تھا۔

باہر پھر آج ہوا بھری ہوئی ڈائن کی طرح ہونک رہی تھی، کھڑکی کے شیشے پر ایک کمزور سی شنی بار بار ٹخ رہی تھی، جیسے ہوا سے بچ کر اندر چھپنے کے لئے دستک دے رہی ہو۔ بڑی مشکل سے آنکھ لگی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی بوندیں ان کے پیروں پر رینگیں تو گھبرا کر جاگ پڑے۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔

حلیہ ان کے پیروں پر منہ رکھے سک رہی تھی۔ جلدی سے انہوں نے پیر کھینچ لئے پھر وہی آنسوؤں کا طوفان، یہ لڑکی تو دشمن سے مل کر ان کے خلاف مورچہ بندی پر تلی ہوئی تھی۔ یہ لوگ انہیں ڈبو کر ہی دم لیں گے۔  
”کیا ہے؟ انہوں نے ڈپٹا۔“

”کیا میں اتنی گھناؤنی ہوں کہ سرکار کے پیر بھی نہیں چھو سکتی۔“ حلیہ

کراہی۔

”بھئی یہ کیا گدھا پن ہے۔ جاؤ ہمارے کمرے سے۔“

”نہیں جاؤں گی، کیا سمجھا ہے مجھے، باندھی ہوں، کوڑھن تو نہیں۔ سارا محل میرے جہنم میں تھوک رہا ہے، میرا مذاق اڑایا جا رہا ہے کہ آپ کو مجھ سے گھن آتی ہے۔ میں آپ کے لائق نہیں۔ کل سے سروری آپ کی خدمت گزاری پر مقرر کی



جائے گی۔“

”ہم اس سور کو بہت ماریں گے۔ ہمیں خدمت گزاری کی کوئی ضروری

نہیں۔“

”ہو جائے گی، ضرورت، حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ۔۔۔۔!“

”جھک مارتے ہیں حکیم صاحب الو کے پٹھے۔“

”تو میں کیا کروں۔“

جاؤ، سو جاؤ بہت رات ہو گئی۔“

”میرے لئے کیسا دن اور کیسی رات، پر اتنا تو احسان کیجئے کہ مجھے زہر ہی لا

دیجئے۔“

”ہم کیوں لادیں زہر؟ بیوقوف، کیسی باتیں کر رہی ہے۔ خود کشی گناہ ہے۔“

”تو پھر باقر نواب کی آگ میں جا کر جلوں، انہیں گرمی کی بیماری ہے۔

چھوٹے میاں۔“ حلیمہ پھر دریا بہانے لگی۔

”نواب باقر، ان کمبخت کا ذکر کیا ہے۔“

”انہی کا تو ذکر ہے، آپ سروری کو قبول کر لیجئے، مجھے ان کے ہاتھ بیچا جا رہا

ہے۔۔۔۔۔ ولایتی کتوں کی جوڑی کے عوض جو اٹھارہ سو کی تھی۔“

”افوہ کیا بکو اس ہے۔“

”باقر نواب اندر سے سڑ رہے تھے، مہترانی بو بو سے کہہ رہی تھی۔ بو بو کو تو

مجھ سے بیر ہے۔ میں نے جبار کے منہ پر جوتی مار دی تھی۔“

ٹھنڈے دل سے حلیمہ نے سمجھایا تو غصہ سے کانپے لگے۔ ان کا جی چاہا حلیمہ

کے آنسو اپنے دامن میں سمیٹ لیں، مگر اسے ہاتھ لگاتے جی کانپ رہا تھا کہ ہاتھ لگا

تو چھوٹا مشکل ہو جائے گا۔

”کیا تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو؟“ جھمن میاں نے پوچھا۔

میرے اللہ ساری دنیا کو معلوم ہے، حربہ بیٹا بچپن کی مانگ ہے، آپ کی۔“

”اور تم؟“



”میں تو آپ کی باندی ہوں۔“

”تم ہماری باندی ہو۔ تمہاری باندی ماں تو باندی نہیں تھی۔ نہ تمہارا باپ باندی زادہ تھا۔ تم تو سیدانی ہو حلیمہ۔ تمہارے ابا کسان تھے۔“

حلیمہ۔۔۔۔۔ سینو حلیمہ۔۔۔۔۔ اس نے اس کے دونوں ہاتھ مٹھی میں پکڑ لئے۔ سنو تو ہم پیاری امی سے آج ہی کہیں گے کہ ہم حرمہ سے شادی نہیں کریں گے۔ ہماری شادی تم سے ہوگی۔“

”شادی! حلیمہ نے جھٹکے سے دونوں ہاتھ چھڑا لئے ”توبہ توبہ آپ تو واقعی بچوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ یاد ہے الف کا انجام‘ صادق نواب نکاح کر رہے تھے‘ زہر دلوا دیا بڑی بیگم صاحبہ نے‘ ہائے کیسی تڑپی ہے تین چار دن‘ دم ہی نہ نکلتا تھا موئی کا چھوٹے میاں‘ ایسا ہی ہے تو اپنے ہی ہاتھوں سے گلا گھونٹ دیجئے۔“ حلیمہ نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے گلے پر رکھ لئے۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا‘ حلیمہ کا جسم گوند کا بنا ہوا تھا۔ ہتھمن کے ہاتھ الجھ گئے۔

”جاؤ۔۔۔۔۔ جاؤ حلیمہ۔۔۔۔۔ پیاری حلیمہ۔۔۔۔۔ جا۔۔۔۔۔ جا۔۔۔۔۔“ انہوں نے سمیٹ لیا۔

”اف کتنے ٹھنڈے ہیں تیرے ہاتھ۔۔۔۔۔ حلیمہ۔۔۔۔۔“

”تو گرم کر دیجئے میرے سرکار!“ اس نے ہتھمن میاں کے کرتے کے بٹن کھول کر اپنے چھوٹے چھوٹے سرد ہاتھ ان کے بڑے قرار اچھلتے ہوئے دل پر رکھ دیئے۔ روتے سکتے دو معصوم نا تجربہ کار بچے ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئے۔ باہر ہوا دبے پیر شرمائی ہوئی نئی دلہن کی طرح آہستہ آہستہ جھوم رہی تھی۔

ہتھمن میاں کی تو ہر بات بے تکی اور نرالی ہوا کرتی تھی۔

سب ہی ان پر ہنستے تھے۔ کھلونوں سے کھیلتے ہیں‘ ان کی پوجا نہیں کرنے لگتے۔ بیگم نے اس صبح کیا اطمینان کی سانس لی تھی۔ جب بو بو نے انہیں جھک کر



سلام کیا۔ اور جی کھول کر مبارک باد دی تھی۔ آٹھ بجے تھے اور ماشاء اللہ ابھی تک دروازہ بند تھا۔

پھر جب صاحبزادے کالج چلے گئے تو بیگم نے اپنی آنکھوں سے ثبوت دیکھ کر دو رکعت نفل شکرانے کے پڑھے۔ حلیمہ کو حرارت ہو گئی تھی۔ اپنی کوٹھڑی میں منہ اوندھائے پڑی تھی۔ بوبو آتے جاتے گندے مذاق کر رہی تھی۔ سارے محل میں غلغلہ تھا کہ چھوٹے میاں نے حلیمہ کو قبول کر لیا۔ دوسری باندیاں کلتی پھر رہی تھیں۔ حلیمہ قسمت والی تھی کہ ایسا بجل معصوم دولہا ملا۔ اپنی بات چیت میں باندیاں دولہا کہہ کر ہی دل کو سارا دے دیا کرتی تھیں۔

لڑکیوں کو دیکھ کر جھمن میاں کے ہمیشہ ہاتھ پاؤں پھول جایا کرتے تھے، مگر حلیمہ کو ایک بار چھو کر وہ کسی کام کے نہ رہے۔ خالی گھنٹہ ملا اور بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ یار دوست چھٹی اتوار کے دن آتے ہیں، میاں بہانہ بنا رہے ہیں، مجھے پڑھنا ہے اور پڑھتے بھی تو حلیمہ کے زانوں پر سر رکھا ہوا ہے ہر فل شاپ پر پیار کا نکتہ۔ ”گنوار لٹھ“ کاش ذرا پڑھ لیا ہوتا تو میرے نوٹ فیر کر دیتی۔“ اور حلیمہ بیٹھی کونسلے سے زمین پر اے۔ بی۔ سی۔ ڈی کاڑھ رہی ہیں۔

”میرے فونٹین پلن میں سیاہی تو بھر دو یار۔“

سیاہی میں دونوں ہاتھ، ٹاک، منہ، اوڑھنی رنگ گئی اور اوپر سے ٹسے، بالکل گدی ہے۔ بڑا اعلیٰ انتظام ہوا کرتا تھا، میاں کو ایک حصہ الگ محل کا دے دیا جاتا تھا۔ باندی سے پھر کسی اور کام کی توقع نہیں کی جاتی تھی۔ حلیمہ تو نایاب بوبو کی سیدھائی تھی۔ بیگم کا ہاتھ منہ دھلانے پر ضد کرتی۔ پاندان پونچھنے سنوارنے، تازہ کتھا چونے بھرنے اور چھوٹے موٹے کام سے منہ نہ موڑتی۔

”اے بھی بس اپنے چھوٹے سرکار کو سنبھالو۔“ بیگم اسے ٹالتیں، مگر وہ سر ڈھکے گردن جھکائے ضد سے ان کے پیر دباتی۔ ساس ہی تو ہوئیں۔ ان کا پوت بھی تو لونڈی کے پیر چومتا ہے۔

نئے جوڑے زیور سب ہی کچھ دیا جاتا تھا۔ بالکل علیحدہ گھر ڈاری کا سا لطف



آجاتا تھا۔ جی چاہا تو اپنی طرف کے باورچی خانہ میں کوئی تازہ چیز جھٹ پٹ بگھار لی۔ روز مالن بھر نوکری پھول گجرے دے جاتی۔ مگر بیج پر پھول چمن میاں کو کبھی نہ بھائے۔

”بھئی بڑا دکھ ہوتا ہے، پھولوں پر چڑھے لیٹے ہیں۔ بڑی بے رحمی ہے۔“ وہ سارے پھول سمیٹ کر حلیمہ کی گود میں بھر دیئے۔

نایاب بوبو وہی اپنے طوطے جیسی رٹ لگائے ہوئے تھیں کہ ادھر متلیاں لگیں، ادھر موٹی مردار ہوئی۔ لوگ بیاہتا تک کو جی سے اتار دیتے ہیں تو باندی کی بھلی چلائی۔ جنم کا جنون اور لگن دیکھ کر بوبو سمورے آنکھیں نیم باز کر لیتیں۔

سوچتی ہوں کہ اب کے خالی چاند میں نکاح ہو جائے مجھے کچھ فیروزہ خانم، اکھڑی اکھڑی لگیں۔“

بیگم نواب اب جنم میاں کی مردانگی سے مطمئن ہو کر بولیں۔

کنے والوں کے منہ میں خاک، سنتے ہیں حرمہ بیٹیابی آزاد ہو گئی ہیں۔ بوبو نے اطلاع دی۔

بیگم کنے والوں۔۔۔۔۔ کے منہ میں انگارے کہ کوئی ارشد میاں کا یار ہے۔ بہت آنا جانا ہے اس گھر میں۔“

”ہے ہے، تم سے کس نے کہا؟“

طرحدار کی دلہن بہت آتی جاتی رہتی ہیں، ان کی ممانی لگتی ہیں جو سوزن کاری سکھانے جاتی ہیں مریم بیٹا کو کہہ رہی تھیں خوب گیند بلا ہووے ہے۔ اللہ رکھے اپنے میاں کی پڑھائی میں کون سے روڑے اٹکتے ہیں۔ میری مانے تو جنم میاں کا حرمہ سے نکاح ہو جائے تو اچھا ہے۔

مگر لڑکا تو پٹھے پڑھاتھ نہیں رکھنے دیتا۔ کہتا ہے کہ حلیمہ سے ہی نکاح پڑھوا دو۔ میں نے کہا ہے اب تو کہا ہے، پھر اگر یہ خرافات منہ سے نکالی تو قسم سے جان دے دوں گی۔“

اے بیگم بکتے ہیں، ان نوابوں کے قول و فعل میں کون سی سنگت تیل دیکھے



تیل کی دھار دیکھئے۔ اسی اٹھوارے میں سیدھے کھڑا ہو جائیں گے۔ لونڈیا مجھے کچھ مری مری سی لگتی ہے۔“

بو بو سے محل کا کوئی راز پوشیدہ نہ تھا۔ گائے بھینس حتیٰ کہ شاید چوہوں تک کا پیر بھاری ہوا کہ بو بو نے تاڑ لیا۔ وہ تو مرغیوں کے منہ لال دیکھ کر سمجھ جاتی تھیں کہ کڑکی اتر گئی اور انڈا دینے والی ہے۔

”پاری امی کیا حلیمہ گاؤں جا رہی ہے؟“ ہتھمن نے آخر دوپٹو پوچھ ہی لیا۔ حلیمہ کئی روز سے ٹیسٹسٹور رہی تھی۔

ہاں چندا، نایاب بو بو بھی ساتھ جائیں گی۔ امی حضور سے میں نے کہلوا دیا ہے کہ تمہارے لئے نیبو کا اچار ضرور ارسال فرمائیں۔“

”مگر پاری امی“ ہتھمن بولے:

”حلیمہ کو کیوں بھیج رہی ہیں۔ میرے کپڑے کی دیکھ بھال کون کرے گا۔“

”سروری ہے، لطیفہ ہے۔“ ”سروری، لطیفہ نے میری کسی چیز کو ہاتھ بھی لگایا تو۔۔۔۔۔ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ ہاں، مگر حلیمہ کو کیوں بھیج رہی ہیں۔“

ہتھمن منمنائے۔

”ہماری مرضی۔ تم ان معاملوں میں کون ہوتے ہو دخل دینے والے۔“

”مگر پاری امی۔“

”میاں ابھی تو ہم جیتے ہیں۔ قبر میں تھوپ آؤ۔ تب من مانی کرنا۔“ پاری امی کی آنکھوں میں سے چنگاریں چمکنے لگیں۔ اندرون خانہ کے معاملہ میں تمہیں کیا تمہارے باوا تک کو دخل نہیں، تمہیں آج تک تکلیف ہوئی ہے جو اب ہوگی۔ باندیوں کے معاملے میں بو بو کا فیصلہ ہی چلتا ہے۔“

”پاری امی، حلیمہ باندی نہیں میری جان ہے۔ سید زادی ہے۔ آپ نے خود بڑے شوق سے انتخاب فرما کر اسے میرے دل میں بھیجا ہے اور کچے ناخنوں کو گوشت سے جدا کر رہی ہیں، کیوں! کون سی چوک ہوئی مجھ سے۔“ انہوں نے کہنا چاہا۔ مگر جذبات نے گلا پکڑ لیا۔ حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ اور وہ سر جھکائے اٹھ



گئے۔

حلیمہ اپنے آنسوؤں سے خائف تھی۔ یہ آخری چند دن وہ دھوم دھام سے گزارنا چاہتی تھی۔ پھر زندگی وفا کرے نہ کرے۔ ابھی چار دن باقی تھے زندگی کے، ان چار سلونے دنوں کے لئے اس نے چار جوڑے نک سک سے تیار کئے تھے۔ عطر کی بو سے تے آرہی تھی، نگر جی پر پتھر رکھ کر اس نے بستر کی ہر تہہ کو بسا دیا تھا۔ بال دھو کر مصالحہ کی خوشبو بھائی تھی۔ ہاتھ پیر کی پھیلکی مندی کو اجاگر کر لیا اور بھر بھر ہاتھ چوڑیاں چڑھالی تھیں۔ کیونکہ بنجمن میاں کو چٹ چٹ چوڑیاں توڑنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ کتنی بھی توڑ ڈالیں۔ ساگ کے نام کی دو چار بچ ہی جائیں گی۔

”گاؤں جانے کا غم نہیں۔“ بنجمن نے اسے پھول کی طرح کھلے دیکھ کر

پوچھا۔ خود ان کا دل لہو ہو رہا تھا۔ و

”نہیں۔“ بو بو نے ٹسوے بہانے کو منع کر دیا تھا۔

”کیوں؟“ انہیں تاؤ آگیا۔

”جلد ہی تو آجاؤں گی۔“

”کتنی جلدی۔“

تھوڑے دنوں بعد۔

”کتنے ہوتے ہیں تھوڑے دن۔“

”بس چھ سات مہینے۔“

”چھ مہینے۔“

”آہستہ بولئے۔“

”ہم مرجائیں گے حلیمہ۔“

”اللہ نہ کرے“ آپ کی بلائیں میرے سر میرے نوشاہ۔ بڑے فال منہ سے نہ

نکالئے۔ اللہ اپنے رحم و کرم سے مجھے آپ کی خدمت کے لئے ضرور واپس لائے

گا۔ سب ہی تو نہیں مرجاتیں۔ صنوبر کی اور بات تھی۔ بڑے سرکار نے لات مار

دی تھی تو پیٹ میں بچہ مر گیا۔ ہائے میں مرجاؤں۔ سہم کر اس نے منہ پر ہاتھ رکھ



لیا۔ یہ وہ کیا بک رہی تھی۔

”بچہ!“ جتھمن تڑپ کر اٹھ بیٹھے۔

”نہیں،‘ نہیں چھوٹے میاں۔۔۔۔۔۔ میں۔“

”میرے سر کی قسم کھا۔“ جتھمن میاں نے اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا۔

”نہیں اللہ نہیں۔“

”چھوٹی،‘ حلیمہ۔“ انہوں نے جلدی سے لیمپ جلایا۔ سہمی ہوئی نظروں سے

تکٹے لگے۔ پھر مجرموں کی طرح سر جھکا لیا۔ گود میں ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔

بچہ،‘ ان کا بچہ زندہ انسان کا بچہ۔“ جی چاہا نہ جانے کیا کریں۔ زور سے ایک

فلاج بھریں۔ یہ آسمان پر جو تارے جگمگا رہے ہیں، سارے کے سارے توڑ کر حلیمہ

کی گود میں بھر دیں۔

”کب ہو گا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”شاید چھ مہینے بعد۔“ حلیمہ شرما گئی۔

”اوہ تب تک تو میرا رزلٹ بھی نکل آئے گا۔“ وہ ٹالنے لگے۔

حلیمہ کا دل جھونکے کھانے لگا۔ گاؤں سے اس بد نصیب کے رونے کی آواز

کیسے پہنچے گی۔ سرکار کے کانوں میں، بے حیا اور ماں کی طرح سخت جان ہوا تو شاید

دوسری لونڈی بچوں کے جھرمٹ میں پل جائے گا۔ باپ اسے پہچانے گا بھی نہیں،

بیٹا نہیں غلام ہو گا، کپڑوں پر استری کرے گا۔ جوتے پالش کرے گا۔ اور اگر بیٹی

ہوئی تو کسی کے پیر دبانے کی عزت حاصل کر کے گاؤں میں زندگی کا تاوان ادا کرنے

چلی جائے گی۔

مگر حلیمہ کی زبان کو تالا لگا ہوا تھا۔ بوبو نے کہہ دیا تھا۔ ”ماںزادی اگر

صاحبزادے کو بھڑکانے کی کوشش کی تو بوٹیاں کر کے کتوں کو کھلا دوں گی۔“

”حلیمہ تم گاؤں نہیں جاؤ گی۔“

”ایسی باتیں نہ کیجئے۔“

”میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔“



”اللہ میرے بھولے سرکار۔“

مگر انہوں نے اسے بولنے نہ دیا۔ بو بو کہتی تھیں پیٹ والی عورت سے مرد ذات کو گھن آتی ہے۔ تو یہ کیسا مرد تھا کہ بالکل وہی پہلے دن کا سا پیار۔ دوسرے دن بچمن میاں نے کالج کولات ماری اور اپنی اکیلی ہستی کا وفد لے کر ہر دروازے پر دھائی دے ڈالی۔

”بھائی جان، حلیمہ کو گاؤں کیوں بھیج رہے ہیں۔“

”میاں، محل کا پرانا دستور ہے۔“

”وہ گائے بھینس نہیں، میرے بچے کی امانت دار ہے۔“

صاحبزادے کا چہرہ تمتھا اٹھا۔ ”بھئی حد کرتے ہو تم بھی۔ یہ باتیں ہمارے سامنے کہتے ہوئے تمہیں شرم بھی نہیں آتی۔ لاجول ولا قوہ۔“ وہ بھنا کراٹھ گئے۔ محل کی پالیکس میں مردوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ پیاری مائیں جب مناسب سمجھتی ہیں، چاق و چوبند باندی پیر دبانے کو مہیا کر دیتی ہیں۔ جب اسے صحت کے لئے مضر اور بیکار سمجھتی ہیں۔ دوسرے کاٹھ کباڑ کی طرح مرمت کے لئے بھجوا دیتی ہیں۔ عوض پر دوسری آجاتی ہے۔ باندی سے جسم کا رشتہ ہوتا ہے۔ شریف آدمی دل کا رشتہ نہیں کر بیٹھتے۔

”افضال بھائی پیاری امی سے کہئے حلیمہ کو گاؤں نہ بھیجیں۔“ انہوں نے اپنے چچا زاد بھائی کی خوشامد کی۔

”لعل دیوانے ہوئے ہو۔ پیٹ والی عورت کے لئے مضر ہوتی ہے۔ کیوں اتنا سٹٹاتے ہو۔ دوسرا انتظام ہو جائے گا۔“ انہوں نے ہنس کے ٹال دیا۔

”مجھے دوسرا انتظام نہیں ہونا چاہیئے۔“

”اور پھر دسمبر میں تمہارا نکاح ہے حرمہ بی بی سے۔“

”میں حرمہ سے شادی نہیں کروں گا۔“

”حلیمہ گاؤں جائے گی تو میں کالج چھوڑ دوں گا۔“ انہوں نے اعلان کر دیا۔

”اچھا جی صاحبزادہ کی یہ مجال۔“ بیگم کا خون کھول گیا۔ ”اسے ضد کرنا آتی



ہے تو ہمیں بھی جواب دینا آتا ہے۔ اب تو چاہے میری میت اٹھ جائے، نامراد حلیمہ یہاں ایک گھڑی نہیں رہ سکتی۔ پرسوں ورسوں نہیں، نایاب تم اسی وقت تیار کرو۔ قسم جناب کی۔“

”نجم بیٹا بھی اللہ رکھے امید سے ہے۔ فراغت پاکر ولایت جانے کا ارادہ ہے۔“

”اس کا کیا ذکر ہے، خدا جیتا رکھے میری بیٹی کو۔“ انجم بچھن میاں کی بہن کا نام تھا۔

”آمین“ مگر گود والے کو ولایت سنگ تو نہ لے جائیں گے۔ اور وہ دولہا نواب کا اکیلا جانا بھی درست نہیں، وہ نگوڑی فرنگن پھر پیچھے لگ گئی۔ تو قیامت ہی آجائے گی۔“

”اے ہے نایاب کہنا کیا چاہتی ہو۔“

”نجم بیٹا بھی زحمت سے بچ جائیں گی۔ وہ لندن جائیں گی تو بعد میں حلیمہ ان کے بچے کو دودھ پلا سکے گی۔ اچھا پاک دودھ بھی بچے کو ملے گا۔“

”جو حکم سرکار۔“

”مگر گاؤں میں اچھی دیکھ بھال نہ ہو تو۔۔۔۔۔ حلیمہ وہاں پان تو ہے ہی، یہاں نظروں کے سامنے رہے گی۔ میرے ہاتھ کے نیچے، موئی کو اچھی طرح ٹھساؤں گی اور پھر صاحبزادے کی ضد بھی یوری ہو جائے گی۔“

”خُدا ہی تو نہیں پوری۔۔۔۔۔ کروں گی بس۔“ مگر بیگم ذرا نرم پڑ گئیں۔  
 آپ کی مرضی پر اتنا عرض کروں گی، بس کچھ دن جاتے ہیں کہ میاں کا جی  
 بھر جائے گا۔ اپنا کام نکلے گا۔ ان پر احسان الگ سے ہوگا۔“

نایاب کے پیٹ میں جب جبار نے نزول فرمایا تو فرحت نواب ٹھنڈے پڑ گئے۔ جب عورت حاملہ ہو جاتی ہے تو مرد کی دل چسپی ختم ہو جاتی ہے کہ یہ قانون قدرت ہے۔

مگر جھمن میاں قانون قدرت اور نایاب بو بو کو جھٹلا رہے تھے، کیونکہ وہ



دیوانے تھے کہ پیر کی جوتی کو کلیجہ سے لگا رکھا تھا۔ ایسی بے حیائی تو کسی نوابزادے نے کسی بیگم کے معاملے میں نہیں لادی۔ سر جھکائے مارا مار زچہ بچہ کے رکھ رکھاؤ پر کتابیں پڑھی جارہی ہیں۔ سارا جیب خرچ باندی کے لئے وٹامن کی گولیاں اور ٹانک لانے پر خرچ ہو رہا ہے۔

حلیمہ صحن میں بیٹھی جھمن میاں کے کرتے پر مری کا کام کر رہی تھی۔ کچ سے سوئی انگلی میں اتر گئی۔ وہ جانتی تھی، وہ گاؤں کیوں نہیں بھیجی گئی تھی مگر اس نے جھمن کے خواب چکنا چور نہ کئے تھے۔

جھمن میاں کو ہول سوار ہو رہے تھے۔ انہوں نے اتنے قریب سے حاملہ عورت کبھی نہ دیکھی تھی۔ سنا تھا انجم باجی کے کچھ ہونے والا ہے، مگر وہ تو بس اوڑھے لیٹے دھما بی کر رہا کرتی تھیں۔ گھڑی بھر کو سلام کیا، دور بھاگ لئے۔

انہیں ڈر لگتا تھا کہ حلیمہ کیسے مینڈکی کی طرح پھٹ نہ جائے۔ کتابوں سے بھی تسلی نہ ہوئی تو فرخندہ نواب کے ہاں بھاگے گئے۔

فرخندہ نواب سے سب خاندان والے فرنٹ تھے، کیونکہ کسی زمانے میں وہ اوٹ پٹانگ محبت کر کے ہاتھ جلا چکی تھیں، مگر اشرف صاحب ان کے میاں پولیس میں تھے، اس لئے سب کو غرض پڑتی تھی اور ان کی چالپوسی کرنا پڑتی تھی۔

ویسے بھی بیگمیں ان سے بہت کنتی تھیں کہ وہ بہت عالم فاضل تھیں۔ ان کے بیٹے نعیم سے جھمن کی بہت گھٹتی تھی۔

جھمن میاں کے پرکھوں کو بھی پتہ نہ تھا کہ پیاری امی نے ان کی دلہن کے زیورات کے بارے میں صلاح لینے کے لئے جمعہ کے روز بلایا ہے۔ فرخندہ زیر لب مسکرائیں اور وعدہ کیا کہ جمعہ کے روز آئیں گی تو ان کی حلیمہ کو بھی دیکھ لیں گی۔

پور ٹیسکو سے اتر کر پہلے وہ جھمن کی طرف چلی گئیں۔

فرخندہ نواب نے ان کی بوکھلاہٹ پر سرزنش کی۔ ”حلیمہ بالکل ٹھیک ہے۔

پھٹے دئے گی نہیں۔

اتنا چربی والا کھانا نہ کھلاؤ، پھل اور دودھ دو۔“







جان نہیں، اس لئے کچھ بڑھیا کی گت بنا رہی ہیں۔ وہ ہوتیں تو مجال نہیں یوں میرے منہ پر جوتیاں مارتیں۔“

بو بو پھنپھناتی ہوئیں اٹھ کھڑی ہوتیں۔  
 ”کتنا اچھلتا ہے پاجی؟“ بچمن اس کے چاندی جیسے تنے ہوئے پیٹ پر ہتھیلیاں رکھ قدرت کی ہنگامہ آریوں پر متحیر ہو رہے تھے۔  
 ”اتنی ٹھنڈی کیوں پڑ گئی لیمو۔“ بہت پیار آتا تو بچمن میاں حلیمہ سے لیمو اور لیمو سے لیمو کہتے۔

بچمن نے اسے رضائی میں سمیٹ لیا اور لمبی لمبی سانسیں بھر کر سونگھنے لگے۔ کیسی مہکتی ہے لیمو جسے پکا ہوا دسری جی نہیں بھرتا، پانی کا چھلکتا کٹورہ روز پو روز پیاس تازہ، مگر اتنا پیار کرنا خود غرضی ہے۔ مرجھاتی جاتی ہے۔ نہیں اب وہ اسے ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔ اے وقت یہیں ٹھہر جائے نہ پیچھے مڑ کر دیکھ، نہ آگے نظر ڈال کر پیچھے چھوٹا اندھیرا ہے اور آگے؟ آگے کیا بھروسہ ہے۔

”غضب خدا کا حلیمہ نے کیسی دغا دی ہے۔“ بیگم نے نواہی کے منہ میں شہد میں انگلی ڈبو کر دے دی۔ ”نایاب تمہارا منہ ہے کہ گلوڑا بھاڑ کہتی تھیں دونوں ساتھ جنیں گی۔ نجم دھاروں دار رہی ہیں۔ بچی کو دودھ چھوا لے کی روادار نہیں اور تمہاری حلیمہ ہے کہ بچہ نہیں جن پاتی۔ تم تو کہتی تھیں کہ حلیمہ کا بچہ گاؤں بچھوا کر نجم کے بچے کو اس کے سپرد کر دو گی۔ اب کیا ہو گا۔“

نایاب کی بات نہ ٹلے۔ چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے۔ وہ نکلے کی باندی حلیمہ کی یہ مجال کہ سارا پود گرام چوٹ کئے دیتی ہے۔

حلیمہ بیٹھی نارنگیوں کا رس نکال رہی تھی۔ ابھی چھوٹے سرکار میچ جیت کر آتے ہوں گے۔ بو بو اسے گھور رہی تھیں جیسے چیل جھٹا مارنے سے پہلے اپنے شکار کو تاکتی ہے۔ آج بڑی برہم نظر آرہی تھیں۔

”حلیمہ ادھر آ۔“ انہوں نے کرخت آواز میں پکارا۔ حلیمہ تھرا اٹھی۔



”ہوں تو یہ گل کھلایا ہے۔“ انہوں نے اس کو سر سے پیر تک گھورا۔ ”بول  
حرام خور یہ کس کا ہے؟“ جیسے انہوں نے آج پہلی بار اس کا پیٹ دیکھا ہو۔  
”یہ۔۔۔۔۔ یہ نارنگی گلی۔۔۔۔۔“

”نارنگی نہیں، نامراد یہ تربوز۔“ انہوں نے اس کے انڈے ہوئے پیٹ پر  
پنکھیا سے جھپکا مارا۔ حلیمہ دم بخود رہ گئی۔ آج تک کسی نے اس کے پیٹ کے قطر  
پر کوئی بات چیت نہیں کی تھی۔ وہ گنگ بس آنکھیں پھاڑے سن رہ گئی۔  
”اب بولتی ہے کہ لگاؤں ایک جوتی اس تھوہرے پر، حرامزادی قظامہ۔“  
منجھلی نواب کی باندی گوری بی سے جب نایاب نے یہی سوال کیا تھا تو اس  
نے پھٹ سے جواب دے دیا تھا۔

حلیمہ کی زبان تالوٹے چٹ گئی۔ کوئی اس کی بوٹیاں کر ڈالتا۔ وہ چھوٹے  
سرکار کا نام نہ لیتی۔ لن کا گناہ تو اس کا سب سے پارا ثواب تھا۔  
”منہ سے پھوٹی کیوں نہیں جنم جلی؟“ انہوں نے چٹاخ سے دیا ایک تھپڑ  
کیے انگوٹھی گال میں چبھ گئی اور خون نکل آیا۔

بتنمن میاں ہٹ پر ہٹ لگا رہے تھے۔ سارا میدان تالیوں سے گونج رہا تھا۔  
تالیوں کے شور میں بتنمن نے چاندی کا کپ دونوں ہاتھوں سے سنبھالا تو ایسا  
لگا حلیمہ کا چکنا رو پہلی پیٹ دھڑک رہا ہے۔  
حسب عادت بتنمن میاں بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ حلیمہ کو  
پکارا، جواب نہ پایا تو کپ لئے پسینے میں تر پیاری امی کے پاس دوڑ پڑے۔  
”اے میاں یہ لوٹا کہاں سے اٹھالائے اچھا خوبصورت ہے۔“  
”یہ لوٹا نہیں بو بو، کپ ہے۔“

”اے بیٹے جان، ذرا حکیم صاحب کو فون کرو کہ ٹانگوں میں پھر سے اینٹھیں  
شروع ہو گئی ہے۔“ پیاری امی کراہنے لگیں۔  
جی بہت اچھا۔ بو بو، حلیمہ سے کہو بڑی گرمی ہے، سوتی کرتا نکالے۔“



ٹیلی فون کر کے واپس لوٹے تو بوبو نے اشارے سے کہا سو رہی ہیں۔  
 ”میرے کپڑے؟“ بوبو نے اشارے سے اطمینان دلایا۔

”حلیہ کہاں ہے۔“ وہ نما کر نکلے تو سروری پاجامے میں آزاد بند ڈال رہی تھی۔

”ہم پوچھتے ہیں حلیہ کہاں ہے اور تو بکواس کئے جا رہی ہے۔ ہتھمن غرائے۔  
 اللہ ہمیں کیا معلوم۔ شاگرد پیشے میں ہوگی۔ سروری آج بڑی بنی ٹھنی آرہی تھی۔

”شاگرد پیشے میں؟ جا بلا۔“ انہوں نے پاجامہ اس سے چھین لیا۔  
 سروری مسکرائی اور میلے کرتے سے ہٹن نکال کر اچلے میں ڈالنے لگی۔  
 ”ارے سنا نہیں تو نے چزیل، چل بھاگ کے جا۔“ انہوں نے اس سے کرتا ہٹ کر پھینک دیا۔

”بوبو نے ہمیں بھیجا ہے۔“  
 ”تجھے بھیجا ہے؟ کیوں؟“ سروری آنکھیں جھکائے ہنس دی۔  
 ”الو کی پٹھی! ہتھمن نے ریکٹ لتارا۔ سروری بڑے ناز سے ٹھکتی جھانجن بجاتی چلی گئی۔

پانچ پھر دس منٹ گزر گئے۔ ہتھمن جھلائے تولیہ باندھے میگزین الٹ پلٹ کرتے رہے۔ جب پندرہ منٹ گزر گئے تو بے قرار ہو گئے۔  
 ”ارے ہے کوئی؟ وہ حلیہ کو اسی طرح آواز دیتے تھے۔  
 سروری اترا تی زمین پر ایڑیاں مارتی، پھر نازل ہو گئی۔ اس کی زہریلی مسکراہٹ دیکھ کر ہتھمن کا جی دھک سے رہ گیا۔

”چزیل سچ بتا، نہیں تو۔“ انہوں نے اس کی چٹیا کلائی پر لپیٹ کر مروڑی۔  
 ”ہئی میں مر گئی، ہائے میری حمیا، سرکار ادھر شاگرد پیشے میں ہے۔“  
 ہتھمن نے اس کی چٹیا چھوڑ دی اور سارے بدن سے کانپے لگے۔ جلدی سے سلیر پیر میں ڈالے اور بھاگے۔







”کیا ہے؟“ وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے۔  
 ”وہ“ وہ۔۔۔۔۔ ذرا آپ سے ایک بات کہنا ہے۔“ انہوں نے لرزتے  
 ہاتھوں سے ان کی آستین کھینچی۔  
 ”ٹھہرو میاں ذرا یہ بازی دیکھو، کیا ٹھاٹھ جمایا ہے، اے بھائی قدوس شہہ  
 بچے ورنہ۔“

”بھائی جان۔“ بچمن کا دم نکلنے لگا۔  
 ”میٹھو ذرا، ہاں بھائی قدوس۔“  
 کوئی بیس منٹ لگے، مگر بچمن پر بیس صدیاں گزر گئیں۔  
 ”ارے ہاں بھی کپ مار دیا تم نے، مبارک ہو۔“ انہوں نے پلٹ کر بڑے  
 جوش سے کہا۔

”بھائی جان حلیمہ۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ پلیز ڈاکٹر نی منگوا دیجئے۔“  
 ”ہوں۔ آجائے گی اگر کوئی ضرورت پڑی تو۔۔۔۔۔“  
 ”نہیں بھائی جان حلیمہ مر جائے گی۔ کچھ کیجئے۔“  
 ”تو کیا میں خدا ہوں۔“ جو کسی کی آئی کو ٹال دوں گا، مگر شرم نہیں آتی ایک  
 باندی کے لئے بڑبڑائے پھر رہے ہو، کچھ تو لحاظ کرو، ایک آوارہ چھوکری کو سر پر  
 چڑھانا ٹھیک نہیں۔ حرامی پلا جن رہی ہے آوارہ نہیں تو بڑی پارسا ہے۔“  
 ”بھائی جان۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ۔“

اماں اتنا پکلاتے کیوں ہو، نکاح نہیں تو عورت فاحشہ ہے، زانیہ ہے، سنگسار  
 کرنے کے قابل ہے، مر جائے تو اچھا ہے۔ خس کم جہاں پاک۔“  
 ”مگر میں بھی تو گناہ گار ہوں۔“

”تو میں کیا کروں، جاؤ اپنے گناہوں کی توبہ کرو۔ میرا سر کیوں چاٹ رہے  
 ہو۔“

اس قدر کوڑھ مغز انسان سے بات کرنا حماقت تھی۔ کوئی اور ہوتا ان کی  
 جگہ تو بچمن منہ توڑ دیتے، مگر بچمن سے بڑے بھائی کی عزت کرنے کی کچھ ایسی



عادت پڑ گئی تھی کہ خون کے سے گھونٹ پی کر گردن لٹکائے چلے آئے۔  
دیوانوں کی طرح جھمن نے ہر چٹو کھٹ پر تھا پنجا۔ باپ کے سامنے گڑ گڑائے،  
مگر انہیں گل بہار نامراد نے ایسا جلا کر خاک کیا تھا کہ باندی کے نام سے ہی تین  
فٹ اچھل پڑے۔

تمہاری یہ مجال کہ ہمارے سامنے اپنی بد کاریوں کا اس ڈھٹائی سے اقرار  
کرو۔ ایک تو موری میں منہ دیتے ہو، پھر اس میں سارے خاندان کو لتھیرنا چاہتے  
ہو۔

انہوں نے پیاری امی کے تلوؤں پر آنکھیں ملیں، مگر انہوں نے ہسٹریا کا  
دورہ ڈال لیا۔ ایسی بات سننے سے پہلے وہ بہری کیوں نہ ہو گئیں۔ اندھی ہو گئی ہوتیں  
تو یہ دن تو دیکھنا نہ پڑتا۔

چچا ابا کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

لاحول ولا قوہ! اماں مرنے دو سالی کو، ہم تمہیں اپنی ماہ رخ دیدیں گے۔ واللہ  
کیا پٹاخہ ہے ایک چمرخ سی باندی کے پیچھے دم دیئے دے رہے ہو۔ یہ سب تمہاری  
ان واہیات کتابوں کی خرافات ہے۔

لوگ مسکرا رہے تھے۔ ان پر لطیفے چھوڑ رہے تھے اور وہ شاگرد پیشے کے  
آگے سرد اور سیلی زمین پر بیٹھے رو رہے تھے۔ اٹھارہ برس کا لڑکا دودھ پیتے بچوں کی  
طرح مچل رہا تھا۔ دھاروں دھاروں رو رہا تھا۔

ابا حضور غصے سے گرج رہے تھے۔ اگر بیگم نے دورہ نہ ڈال لیا ہوتا، تو وہ  
اس نیک خاندان کی ہنر سے کھال ادھیڑ دیتے۔ جس دن انہوں نے سنا تھا کہ فرزند  
ارجمند نے لونڈی ٹھکانے لگا دی تو ان کی گپھے دائر مونچھیں مسکراہٹ کے بوجھ تلے  
لرزا نہی تھیں۔ بڑے صاحبزادے تو دعا دے ہی گئے۔ اگر چھوٹے بھی اسی راہ نکل  
گئے ہوتے تو جائیداد کا وارث کہاں سے آتا؟

ایسا تماشا لوگوں نے کبھی نہ دیکھا نہ سنا، نوکر ہنس رہے تھے، باندیاں ٹھٹی ٹھٹی  
کر رہی تھیں۔



ادھر بان کے بھٹکنے میں پڑی حلیمہ مورانی کی طرح کوک رہی تھی کھرے پھانسو دار بان سے اس کی ہتھیلیاں چھل گئی تھیں۔

”ہائے سروری‘ وہ فرش پر بیٹھے ہیں۔ اٹھا وہاں سے جہنم جلی۔ سردی لگ جائے گی ان کے دشمنوں کو۔“ اگر درد کے بے رحم حملے اسے وقفہ دیتے تو وہ انہیں اپنے سر کی قسم دے کر زمین سے اٹھا لیتی۔ نہیں قسم خدا کی، ان سے کوئی شکایت نہیں۔

مگر دردوں کی مہیب موجیں اس کے پسینے میں ڈوبے بے ڈول جسم کو مضبوط رہی تھیں۔ اس نے اپنے ہونٹ چبا ڈالے کہ اس کی آواز سن کر جہنم میاں دیوانے نہ ہو جائیں۔ پر دل کے کان سب سن لیتے ہیں۔ جہنم پر نزع کی کیفیت { طاری تھی جی چاہ رہا تھا کہ پتھر پر سردے ماریں۔ کہ یہ کھولن پاش پاش ہو جائے۔ اچانک دور سے کسی نے ایک دم پکارا۔ غم و اندوہ کے گہرے کنویں سے انہیں اوپر کھینچ لیا۔ انہوں نے پورٹیکو سے سائیکل اٹھائی اور ویسے ہی کچھڑ میں لت پت تیزی سے پھانک سے بال بال بچتے ہوئے نکل گئے۔

”ہائے میرا لال۔“ بیگم نے ہوش میں آکر چھاتی پیٹ لی۔

”اے ہے جہنم خیر تو ہے۔“

کچھڑ میں سر سے پیر تک نہائے آنسو کے دریا بہاتے جہنم ہچکیوں سے ندھال رو رہے تھے۔

”حلیمہ۔۔۔۔۔ پھپھو۔“

”اچھی تو ہے۔“

”مرگئی۔ مر رہی ہے۔۔۔۔۔ پھپھو۔۔۔۔۔ کوئی نہیں سنتا۔“

”بھئی بڑے بے وقوف ہو‘ میں نے تم سے کہا تھا مجھے فوراً اطلاع کرنا‘ میں

ابھی فون کرتی ہوں ایسولینس کے لئے ہسپتال پہنچا دیا جائے۔ وہاں محل میں تمہارے بڑوں سے کون لڑے جا کر۔“

”میں کرتا ہوں۔“ اشرف ان کے شوہر نے فون اٹھایا۔



”میرا آج فائل تھا‘ پھپھو‘ وہاں سے آیا تو۔۔۔۔۔ پتہ چلا‘ پھپھو‘ مر جائے گی‘  
 مر بھی گئی ہوگی‘ اب تک تو۔۔“  
 ”نہیں بھائی مرے درے گی نہیں۔“

جب فرخندہ نواب کی موٹر آگے اور پیچھے ایسولینس پمپی تو محل میں کھرام مچ گیا۔ بیگم نے فی البدیہہ ایک عدد دورہ ڈالا اور لب دم ہو گئیں۔ نواب صاحب نے رائفل میں کارتوس ڈالے اور پھنپھناتے ہوئے نکل پڑے۔ مگر ایسولینس کے پیچھے پولیس کی جیپ نظر آئی تو پلٹ پڑے۔ خاندان کی ایسی تھڑی تھڑی تو جیب بھی نہیں ہوئی تھی۔ جب منجھلے نواب کی جاگیر کورٹ ہوئی تھی۔

فرخندہ نواب نے ادھر دیکھا نہ۔ ادھر‘ سیدھی کال کو ٹھڑی میں دندناتی گھس گئیں۔

جسمن نے خون میں نہائی باندی حلیمہ کو بانہوں میں سمیٹ لیا اور محل میں صف ماتم بچھ گئی۔ بیگم کی بے ہوشی جا کر لبوں پر کوسنے آگئے۔  
 اگلے روز ایک قلم کی جنبش سے جسمن اپنے حق سے دست بردار ہو گئے۔  
 کون سی گاڑھے پسینے کی کمائی تھی جو درد ہوتا۔ جو اباً حضور نے فرمایا۔ انہوں نے بے دریغ دستخط کر دیئے اور جائیداد سے عاق قرار پا گئے۔

جسمن اب ایک چھوٹی سی گلی میں ایک سڑیل سے مکان میں رہتے ہیں۔ کسی سکول میں گیند بلا سکھاتے ہیں۔ کالج بھی جاتے ہیں۔ سائیکل کے کیریر پر سودا سلف کے درمیان کبھی کبھی شرتی آنکھوں والا ایک بچہ بھی بیٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ تو گئے خاندان سے۔ اتنا پڑھ لکھ کر گنوا یا۔ ایک باندی گھر میں ڈال رکھی ہے۔ پتہ نہیں باندی سے نکاح بھی کیا ہے کہ نہیں۔ اللہ اللہ کیسے برے دن آئے ہیں۔







صحت کے افسانے گویا عورت کے دل کی طرح ہنچ اور اٹھار گزار  
 ٹھہر آتے ہیں۔ گئے یہ افسانے اس دور سے قطعاً معلوم ہوتے ہیں جو  
 عورت میں ہے۔ اس کی دنیا میں ہے۔ اس کے دل میں ہے۔ اس کے  
 ظاہر میں ہے اس کے دامن میں ہے۔

(کرشن چندر)

صحت کی شخصیت اردو ادب کے لئے باعثِ فخر ہے۔ انہوں نے بعض  
 ایسی پرانی قصیدوں میں دھننے ڈال دیئے ہیں۔ کہ سب نگاہ کھلائی گئیں  
 نئی دہائی آنکھوں سے اور تھیل تھے اردو ادب میں جو امتیاز صحت ہندوستانی  
 کو حاصل ہے اس کا منظر ہر ناگہانی اور نئی سے کم نہ ہو گا۔

(پطرس بخاری)



**RHOTAS BOOKS**

Ahmed Chambers, 5 Temple Road, Lahore